ISSN 0974-7346

مئی ۲۰۲۴ء

جلد ۲۱۱ــــعدد ۵

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۳۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۳۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۳۵۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔
اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

(Ma'arif Section) 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۱	ماہ شوال المکرّم ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۲۴ء	عدد ۵

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

e-mail:

info@shibliacademy.org

شذرات

پارلیمنٹ کے عام انتخابات کا موسم ان دنوں شباب پر ہے، آزادی کے بعد ہندوستان کی جمہوری روایات کی زندگی اور اس زندگی کی توانائی اور کمزوری اور بناؤ بگاڑ کا بڑا پیمانہ اور آئینہ ان ہی انتخابات کو سمجھا جاتا تھا۔ وعدوں، وعیدوں، نئے منصوبوں اور حکومت کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا شور کچھ اتنا زیادہ ہوتا کہ ذاتی رنجشوں کے نتیجے میں ذہن اور دہن کے بگاڑ کی خبر کم ہی لی جاتی تھی، مگر گذشتہ ایک دو الیکشنوں نے عصر حاضر کی مقابلہ آرائیوں کا جو منظر پیش کیا اس کے لیے وہی پرانی بات یاد آتی ہے کہ سلطانی اور شیطانی کا فرق ہی اٹھ گیا۔ ایسے ماحول سے یہ کہہ کر پناہ مانگی جاتی تھی کہ:

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد　　　ضمیرش باقی و فانی بہم کرد

ولیکن الاماں از عصر حاضر　　　کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد

لیکن ادھر ملک عزیز میں جس طرح سیاسی تہذیب وثقافت اور حریفانہ اور مسلمہ انسانی اخلاقی رویوں کو بدنما اور گھناؤنا بنانے کی دانستہ کوششیں سامنے آئی ہیں ان کو سلطانی سے شیطانی کو بدلنے کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں نسل پرستی کی سب سے بڑی شناخت کے متعلق یہ تو برسوں سے کہا جا تا رہا ہے کہ:

نگہ دارد برہمن کار خود را　　　نمی گوید بہ کس اسرار خود را

مگر باطن کی سیاہیوں میں چھپی سازشوں اور اسرار کو مکر وفریب کی مہارت کے نشہ میں اب ملک کے سب سے بڑے ذمہ دار اور ہر طبقہ کے ظن ویقین کے مرکز نے اس طرح کھول کر رکھ دیا اور مخالف جماعتوں کے وعدے نامہ سے وہ بات نکالی جس کا اس وعدے نامہ بلکہ سارے فسانہ میں ذکر ہی نہیں تھا۔ اشاروں کنایوں میں تو کلیجہ چھلنی کرنے والے جملوں اور حملوں کی تو قوم گویا عادی ہی ہو چکی تھی لیکن نام لے کر ملک کی دوسری سب سے بڑی اکثریت کو کثرت تولید اور غیر قانونی دراندازکہا جانا یہ شاید ملک کی تاریخ کے صفحات پر سب سے پہلا اور سب سے غلیظ اور سیاہ دھبہ بن گیا۔

***

بجاطور پر ملک کی دوسری جماعتوں نے اس بیان کو شدید تنقید کی زد پر رکھا اور اس بیان کو انتہائی ہولناک، اشتعال انگیز اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کی سنگین خلاف ورزی سے تعبیر کیا اور یہ کہا کہ اقتدار کے لیے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر مبنی اور غلط حوالوں کے ذریعہ سیاسی مخالفین پر بے بنیاد الزامات عائد

کرنا، یہ ملک کی تنہا نسل پرست تنظیم کی تربیت کی خاصیت ہے تو یہ قطعی بے جواز نہیں۔ سیاسی پست فکری اور لہجوں کے نیچ پن میں ایسی سچی آوازوں کی قدر کرنی چاہیے اور ماتم ان کا کرنا چاہیے جو قوم موسیٰ میں شمار کیے جانے کے باوجود ہلاک جادوئے سامری ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو دانشوری کے اوزار سے ایک پرفریب گوسالہ بنا کر بڑی بے حیائی سے کہہ سکتے ہیں کہ **ھذا الٰھکم و الٰہ موسی** اور اردو صحافت کے پردوں میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ **بصرت بما لم یبصرون**، مجھ کو تو وہ سوجھا جو دوسروں کو نظر نہیں آیا، ہم نہیں جانتے کہ خواہشوں کے حریصوں کا وہ وقت کب آئے گا جب وہ اپنے فکری تعفن کی وجہ سے **لامساس** کہتے نظر آئیں گے۔

***

عجیب بات ہے کہ قارونوں اور سامریوں کی سوچ جتنی قدیم ہے اتنی ہی ڈھیٹ ہے۔ ہم تو اپنے بزرگوں کی فکر اور ان کے اندیشوں کے قائل ہیں، سوا سو سال پہلے جب اخبار پانیر کے ایک مسلمان نامہ نگار نے لکھا کہ دوسرے اسلامی ملکوں کے کمزور ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو ہندوؤں سے مل جانا چاہیے، تو علامہ شبلی نے فوراً لکھا کہ ''ہندوؤں سے ملنا اچھی بات ہے بلکہ یہ ہمیشہ سے اچھی بات تھی اور ہمیشہ اچھی رہے گی، لیکن نامہ نگار نے جو جدید ضرورت بیان کی ہے وہ اسلام کا ننگ ہے''۔ علامہ شبلی سب کچھ تھے مگر کسی بھی سوانح نگار کی نظر میں وہ سیاست کے مردِ میدان نہیں شمار کیے گئے، لیکن کمال ہے کہ زندگی کا خاتمہ بالخیر ہونے کے وقت وہ سرسید اور ان کے زیر اثر سیاست یا ان کے اس خیال کہ ''ابھی وقت نہیں آیا ہے'' سے اختلاف کرتے ہوئے اس یقین کو کہاں سے لے آئے کہ ''ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جس چیز کو ہم پالیٹکس سمجھتے تھے وہ پالیٹکس کی تحقیر تھی، جس کے نتیجے میں جدو جہد، سعی و کوشش، حوصلہ مندی، قوت عمل، سرگرمی، جوش اا ور ایثار نفس کے لحاظ سے عام سناٹا چھا گیا''۔ آج اکیسویں صدی کے ربع اول میں بیسویں صدی کے آغاز کی یہ آواز کتنی مانوس سی لگتی ہے کہ ہماری درس گاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک بھی مثال پیش نہیں کی۔ ہمارا قومی تربیت یافتہ گریجویٹ قومی کام میں نرخ بازار سے ایک حبہ اپنی قیمت کم نہیں کرتا، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہمارا پولیٹکل احساس بالکل مر گیا ہے۔ واقعہ ہے کہ علامہ کے انتقال سے صرف دو سال پہلے کا یہ مضمون یا سلسلہ مضامین اس زمانہ میں شاید مخالفتوں کے شور میں کم پڑھا گیا ہو لیکن موجودہ سیاسی حالات میں اس کو ان مضامین سے تعبیر کیا جانا چاہیے جو غیب سے خیال میں آجاتے ہیں۔

***

موجودہ الیکشن میں غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے یہ غیب کا علم رکھنے والا ہی جانے لیکن آئندہ کے لیے شبلی کے یہ الفاظ کیمیائے سعادت ثابت ہوسکتے ہیں کہ ''پالیٹکس دنیا کا سب سے بڑا جذبہ ہے، وہ مذہب کے برابر طاقت رکھتا ہے، وہ انسان میں ہر قسم کا ایثار اور خود فروشی پیدا کردیتا ہے، کیا ہماری موجودہ پالیٹکس نے یہ اوصاف ایک شخص میں بھی پیدا کیے ہیں؟......درخت پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر ہماری پالیٹکس دراصل پالیٹکس ہوتی تو جدوجہد اور ایثار و خود فروشی کے جذبات خود بخود ساتھ پیدا ہوجاتے''۔ شبلی کے مضامین کو کاش قوم سمجھنے کی کوشش کرتی۔ یہ نہیں تو کم از کم شبلی کے اس سوال کا جواب بہرحال تلاش کرتی کہ ''لیڈروں کا قصور ہے یا لیڈر بنانے والوں کا؟''۔

***

غم جہاں کا احساس کرتے کرتے کسی ایسے کی یاد آنا جس کا وجود آج کی دنیا میں علم پروری کی مثال بن گیا ہو، یہ کسی بڑی نعمت سے کم نہیں اور نعمت کا قدرتی تقاضا شکر اور احساس سپاس ہے۔ اوریئنڈا (امریکا) کی محترمہ حمیدہ بانو صاحبہ نے دارالمصنّفین کی قدر شناسی کی ایک نہایت شاندار مثال قائم کردی۔ اس سے قبل وہ معارف کے لیے ایک خطیر رقم کا عطیہ دے کر ایک کارپس فنڈ قائم کرچکی ہیں۔ ان کے تعاون سے کئی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں، ان کا تازہ ترین عطیہ معارف پریس کی تجدید کے لیے ہے۔ وہ دارالمصنّفین کی ضرورتوں سے واقف ہونے میں اپنی راحت محسوس کرتی ہیں، چنانچہ پریس ہی کے لیے انہوں نے ایک ڈیجیٹل پرنٹر اور ایک اعلیٰ قسم کی بائنڈنگ مشین کا بھی انتظام کردیا ہے۔ اس کے لیے شکریہ کا لفظ ہی میسر ہے اگرچہ وہ ہمارے جذبات کے اظہار کے لیے بڑا مختصر ہے۔

***

افسوس کہ مشہور صاحب قلم جناب طارق غازی کا تراسی سال کی عمر میں کناڈا میں انتقال ہوگیا۔ دیوبند کے اس سلسلۂ زریں کا وہ حصہ تھے جس میں قاری طیب، مولانا حامد الانصاری، مولانا محمد میاں منصور انصاری، عابد اللہ غازی وغیرہ شامل ہیں۔ معروف ادیبہ ہاجرہ نازلی ان کی والدہ تھیں۔ قرآنی اقوام نوح، عاد و ثمود وغیرہ پر ان کے مضامین معارف میں چھپ کر بہت مقبول ہوئے۔ ان کی غزلیں بھی معارف کے حصہ ادبیات کی زینت بنتی رہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، اچانک یہ خبر بھی غم کا سبب بنی کہ مولانا عبدالعلیم فاروقی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا عبدالشکور فاروقی کے خانوادہ کی تمام خوبیوں کا وہ نمونہ تھے۔ بڑی نفیس گفتگو اور اس سے کہیں زیادہ وقیع معلومات والے ایسے لوگ اب کہاں؟ **اللھم اغفر له و ارحمه۔**

***

مقالات

سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی: حیات و خدمات

شکیل الرحمٰن
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
shakeelmau7@gmail.com

سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی، حسینی، بہاری، ہندی، ہندوستان کی عظیم المرتبت شخصیت ہی نہیں بلکہ اپنے دور کے شیخ العرب والعجم، نابغہ روزگار اور فردِ وحید تھے۔ ان کے سوانح نگاروں نے حالی کی حیات جاوید کی مانند عقیدت کے نشہ میں ڈوب کر ان کے حالات کو قلمبند کیا ہے۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ان کے حالات کا ایک تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔

خاندانی پس منظر: ان کا تعلق سادات کے ایک گھرانے سے تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب ۳۴ ویں پشت میں جا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ان کے جد اعلیٰ سید احمد شاہ جاجنیری[1] نے ازبکستان سے آکر دہلی میں سکونت اختیار کی تھی[2]۔ سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے میں صوبہ بہار کے موضع اورین کے والی راجہ اندردون نے گئوکشی کے معاملہ میں کچھ مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس کی خبر جب سلطان ایبک کو ملی تو بڑا ناراض ہوا اور ۶۰۰۰۰ سپاہیوں کا دستہ مولانا نورالدین کی قیادت میں اورین روانہ کیا۔ سپہ سالار نے فوج کو ۶۰ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک ہزار پر ایک جنرل مقرر کیا۔ ان میں سے ایک دستے کا جنرل سید احمد شاہ جاجنیری کو بنایا گیا۔ چنانچہ پوری فوج اورین پہونچ کر فتحیاب ہوئی اور راجہ اندردون نے راہ فرار اختیار کیا۔ اس کے بعد سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جو شخص یہاں قیام کرنا

۱۔ یہ ازبکستان کے علاقہ ترمذ یا بخارا کا ایک گاؤں ہے، جس کی نسبت سے جاجنیری لکھا جاتا ہے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ یہ بغداد کا ایک گاؤں ہے (مولانا فضل حسین بہاری، الحیاۃ بعد المماۃ، المکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل، شیخوپورہ، پاکستان، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۴)

۲۔ انہوں نے دہلی میں کب سکونت اختیار کی، تذکرہ نگاروں کے یہاں اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی ہے۔

چاہے اسے مکمل اختیار ہے۔لہٰذا سید احمد شاہ جاجنیری نے موضع ایکساری میں سکونت اختیار کی۔اللہ نے انہیں چار بیٹے دیے تھے جن میں ایک ایکساری ہی میں مقیم رہے اور بقیہ تین نے اس کے نواحی علاقوں میں سکونت اختیار کی۔جو ایکساری میں مقیم تھے ان کے ایک لڑکے نے موضع بلتھوا [۳] میں قیام کیا اور انہیں کی اولاد میں سے سید جواد علی ہیں جو کئی پشتوں سے یہیں پر رہائش پذیر تھے۔ان کے تین بھائی سید چندو، سید عیدو اور سید کلب علی تھے۔سید جواد علی بنیادی عربی تعلیم کے ساتھ فارسی زبان کے ماہر تھے۔اور انہیں کے صاحبزادے ہیں سید نذیر حسین معروف بہ میاں صاحب محدث دہلوی [۴]۔

ان کا خاندان ابتداء سے ہی علم وفضل کے ساتھ فن سپہ گری میں ماہر تھا۔اس خاندان کے لوگوں نے ہندوستان میں قیام کے ابتدائی زمانے سے ہی فوج اور قضا کے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ میاں صاحب کا نسب ماں و باپ دونوں جانب سے سید احمد جاجنیری سے مل جاتا ہے۔حسن اتفاق سے دونوں کے اپنے اپنے امتیازات ہیں، اگر پدری سلسلہ نے فن سپہ گری میں اپنے جوہر دکھائے تو مادری نسبت نے عہدہ قضا کا عظیم فریضہ انجام دیا ہے۔ننہالی رشتہ میں ایک اندازے کے مطابق سید بایزید سے عہدۂ قضا کا آغاز ہوتا ہے اور انگریزی حکومت تک نام کی تبدیلی (رولر سب رجسٹرار) کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ باقی رہتا ہے۔ان میں قاضی وجیہہ الدین، قاضی سید جمال، قاضی سید عبدالنبی، قاضی سید عنایت اللہ، قاضی سید محمد سالم، قاضی سید محمد اکبر غازی اور قاضی سید حفیظ الرحیم وغیرہ کے نام مشہور ہیں [۵]۔

سید جواد علی کا انتقال موضع بلتھوا میں ہوا۔چوں کہ میاں صاحب پہلے سے ہی دہلی میں مقیم ہو گئے تھے، اس لیے سید جواد کے انتقال کے بعد ان کے بقیہ دونوں صاحبزادوں مولوی سید سجاد حسین اور مولوی سید توسل حسین نے قصبہ سورج گڑھ میں رہائش اختیار کی [۶]۔

ولادت اور ابتدائی احوال: میاں صاحب کی ولادت سنہ ۱۸۰۵ء (۱۲۲۰ھ) [۷] میں بہار کے موضع

۳۔ یہ موضع قصبہ سورج گڑھ سے ۵ یا ۶ میل کی مسافت پر جنوب کی سمت میں واقع ہے (الحیاۃ بعد الممات، ص:۱۴)۔

۴۔ بہاری، مولانا فضل حسین، الحیاۃ بعد الممات، ص ۱۳-۱۴

۵۔ الحیاۃ بعد الممات، ص:۱۹

۶۔ ماخذ سابق، ص:۱۵

۷۔ ان کے سن ولادت سے متعلق ۱۲۱۱ھ، ۱۲۱۲ھ، ۱۲۱۶ھ، ۱۲۲۰ھ، اور ۱۲۲۵ھ کی مختلف روایتیں ہیں۔جن میں سے ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) کو ان کے شاگرد مولانا فضل حسین بہاری اور عبدالحی لکھنوی نے راجح قرار دیا ہے۔ (باقی ص ۷ پر)

بلتھوا، قصبہ سورج گڑھ، ضلع مونگیر [۸] میں ہوئی اور وہیں پر ان کی نشو نما ہوئی [۹]۔ ان کے تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے بھی ان کے ابتدائی حالات کو قلمبند نہیں کیا ہے۔ سوائے اس بات کے کہ انہوں نے اپنی عمر کے ابتدائی سولہ سال تعلیم سے دور کھیل کود اور سیر و تفریح میں گزار دیا۔ فن گھوڑ سواری و تیرا کی کے ماہر تھے۔ ان کے ایام کے متعلق مولانا فضل حسین بہاری لکھتے ہیں:

> بچپن کے زمانہ کا کوئی واقعہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر معلوم نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ کھیل کا شوق کافی زیادہ تھا۔ تیرنے، دوڑنے، گھوڑا چڑھنے میں مشاق تھے۔ اور پڑھنے لکھنے کی طرف سے سخت بد شوق۔ عجب نہیں کہ عنفوان شباب تک اسی آزادی کے کھیل اور جمناسٹک کی مشق نے میاں صاحب کی صحت پر اچھا اثر کیا ہو جس سے قوی شگفتہ ہو گئے [۱۰]۔

امام ابو یحییٰ خاں نوشہروی لکھتے ہیں:

> میاں صاحب کا عہد طفولیت لہو و لعب میں گزرا۔ کبھی دریا میں شناوری کے جوہر دکھا رہے ہیں تو کبھی اسپ شہوار کی پشت پر شہسواری کے کرتب، جن سے صحت ہمیشہ کے لیے اچھی ہو گئی، مگر ابھی تک علم کے ایک قطرہ نے بھی دہن کو تر نہ کیا۔ زمانہ اسی طرح گزر رہا تھا..... ایک روز ایک پنڈت کی نصیحت سے

(بقیہ ص ۶) تفصیل کے لئے دیکھیں ''الحیاۃ بعد المماۃ''، ص: ۱۵؛ ''نزھۃ الخواطر'' ۸/ ۱۳۹۱۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے اپنی کتاب غایۃ المقصود فی شرح سنن ابی داؤد (تحقیق: محمد عزیر شمس اور ابوالقاسم الاعظمی، حدیث اکادمی نشاط آباد، فیصل آباد، ۱۴۱۴ھ) ۱/ ۵۱ میں ان کا سن ولادت بالجزم ۱۲۲۵ھ لکھا ہے، لیکن بعد میں انہوں نے اپنی دوسری کتاب ''نہایۃ الرسوخ فی معجم الشیوخ'' میں اس سے رجوع کر کے ۱۲۲۰ھ کو راجح قرار دیا ہے۔ دیکھیں حاشیہ ''عون المعبود علی شرح سنن ابی داؤد'' مطبوعہ دار ابن حزم، بیروت، ۱۴۲۶ھ ۲۰۰۵ء، ص ۱۸

۸۔ یہ صوبہ بہار کا ایک ضلع ہے جو عظیم آباد (پٹنہ) سے ۱۰۰ میل کے فاصلہ پر پورب کی سمت میں واقع ہے۔ یہ علاقہ ایک خاص قسم کے بانس کی پیداوار کا مرکز مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بندوق سازی اور آبنوسی اشیاء کی صنعت کاری میں اسے شہرت حاصل ہے۔

۹۔ لکھنوی، عبدالحی۔ ''نزھۃ الخواطر''، دار ابن حزم - بیروت، ۱۴۲۰ھ، ۱۹۹۹ء، ۸/ ۱۳۹۰، عظیم آبادی مولانا شمس الحق، غایۃ المقصود فی شرح سنن ابی داؤد، ۱/ ۵۱

۱۰۔ الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۲۳

تعلیم کا شوق بیدار ہوا۔[۱۱]

تعلیمی سرگزشت: عام طور سے ان کی تعلیم کا آغاز پندرہ یا سولہ کی عمر میں بتائی جاتی ہے[۱۲]۔ لیکن یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس زمانے میں جب بچے کی عمر چار سال چار ماہ چار دن ہو جاتی تو بلا تفریق امیر و غریب مسلمانوں میں بسم اللہ کی رسم کا اہتمام ہوتا تھا اور یہیں سے بچے کی تعلیم کا آغاز ہوتا تھا۔ یہ بات بھی مسلم ہے کہ میاں صاحب کا تعلق سادات کے ایک خوشحال زمیندار علمی گھرانے سے تھا۔ خود ان کے والد جواد علی فارسی زبان کے ماہر تھے اور ابتدائی عربی سے بھی واقف تھے۔ اس لیے اتنے لمبے عرصہ تک ان کا تعلیم سے بالکل دور رہنا سمجھ سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ ان کی ولادت سورج گڑھ میں ہوئی و نشا بھا و تعلم الخط والإنشاء[۱۳] اور وہیں پر ان کی پرورش ہوئی اور انھوں نے لکھنا وانشاء پردازی سیکھی۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادی مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ نشا بموطنه سورج کر...وقرا القرآن وكتب الانشاء على معلمي بلده ونواحيها[۱۴] یعنی ان کی پرورش و پرداخت ان کے علاقہ سورج گڑھ میں ہوئی... اور اپنے علاقہ وقرب وجوار کے علماء سے ناظرہ قرآن اور لکھنا سیکھا۔

فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے سترہ سال کی عمر میں اپنے دوست بشیر الدین

۱۱۔ نوشہروی، ابو یحییٰ امام خان۔ ''تراجم علمائے حدیث ہند''، مکتبہ اہل حدیث ٹرسٹ، کراچی، ب۔ت۔ص: ۱۳۴

۱۲۔ اس کی بنیادی وجہ وہ واقعہ ہے جس کو مولانا فضل حسین بہاری نے ''الحیاۃ بعد المماۃ'' میں بیان کیا ہے کہ سید جواد علی کے پاس ایک برہمن آتا تھا۔ ایک دن اس نے میاں صاحب سے کہا کہ ''میاں تم اتنے بڑے ہو گئے اور کچھ پڑھا نہیں۔ دیکھو تمہارے خاندان میں سب لوگ مولوی ہیں اور تم جاہل ہو۔'' یہ بات ان کے دل پر نشتر کی طرح لگی اور تعلیم کا شوق جوش مارنے لگا۔ اور انھوں نے اپنے والد عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں (الحیاۃ بعد المماۃ: ۲۴)۔ اس واقعے میں تاخیر سے تعلیم کے آغاز کا ذکر تو ہے لیکن عمر کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ مگر مولانا فضل حسین بہاری نے اس واقعے کے معاً بعد تعلیم کی غرض سے ان کا گھر چھوڑنے کا تذکرہ اس طرح سے کیا ہے:

اس وقت ہمارا ہیرو اپنی عمر کی سولہویں سالانہ منزل طے کر کے سترہویں میں قدم رکھ رہا ہے اور پڑھنے کے شوق میں طبیعت بے چین ہو رہی ہے.......الخ۔'' (الحیاۃ بعد المماۃ: ۲۴) یہیں سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان کی تعلیم کی شروعات ۱۶ سال میں ہوئی۔

۱۳۔ ''نزهة الخواطر'' ۸/۱۳۹۱

۱۴۔ ''غایۃ المقصود فی شرح سنن ابی داؤد'' ۱/۵۱

عرف مولوی امداد علی سے مشورہ کر کے ایک رات دونوں چپکے سے گھر سے نکل گئے[۱۵] اور عظیم آباد (پٹنہ) کے قصبہ صادق پور محلّہ نمو ہیہ پہنچے اور مولوی شاہ محمد حسین کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور انہیں کے گھر پر قیام کیا[۱۶]۔ چھ ماہ یہاں رہ کر انہوں نے ترجمہ قرآن اور مشکوٰۃ کا درس لیا۔ اسی دوران ان کی ملاقات سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ سے پٹنہ کے پولیس لائن میدان میں ہوئی۔ ان کا بیان ہے کہ سید صاحب کا قافلہ گول گھر کے سامنے ٹھہرا تھا اور لین کے میدان میں جمعہ کی نماز ہوئی تھی اور مولانا شہید نے وعظ فرمایا تھا۔ اس وعظ و نماز میں میں بھی شریک تھا۔[۱۷] اس کے بعد دونوں ساتھی مزید تعلیم کے لیے دہلی کا قصد کیا[۱۸]۔ راستے میں مختلف مقامات پر رک کر وہاں کے علماء سے استفادہ کرتے ہوئے چھ سال میں ۱۲۴۳ھ کو دہلی پہونچے۔ عظیم آباد سے چل کر انہوں نے پہلے غازی پور میں قیام کیا اور مولوی احمد علی چریا کوٹی سے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر بنارس کا رخ کیا اور وہاں کچھ دن ٹھہرے۔ یہیں پر انہوں نے آگے کے سفر کے لیے اپنی کچھ[۱۹] کتابیں نو روپئے میں بیچ کر ایک چھوٹا ٹٹو خریدا۔ اس کے بعد الٰہ آباد پہونچے۔ یہاں پر انہوں نے پہلے کچھ دن ایک مسجد[۲۰] میں قیام کیا اس کے

۱۵۔ رازداری اور منصوبہ بندی کے ساتھ رات کی تاریکی میں ان کے گھر چھوڑنے کا بنیادی سبب مولانا فضل حسین بہاری اور مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے غربت تنگدستی کو بتایا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ کیوں کہ اول الذکر نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''میاں صاحب کا خاندان علم وفضل اور دولت و وجاہت میں پہلے سے ممتاز تھا'' (الحیاۃ بعد الممات: ۱۸)۔ اس لئے اس کی اصل وجہ کچھ اور ہی ہے۔

۱۶۔ یہ واقعہ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) کا ہے۔

۱۷۔ الحیاۃ بعد الممات: ۲۶

۱۸۔ لیکن راستے میں ہی کسی مقام پر مولوی امداد علی ان کا ساتھ چھوڑ کر سیدھے دہلی پہونچے۔ اکثر لوگوں نے ان کے دہلی سفر کا اصل مقصد شاہ عبدالعزیز سے استفادہ کو بتایا ہے۔ اس نظریے کے محرک اول مولانا فضل حسین بہاری ہیں۔ لیکن اس پورے سفر کی تفصیلات اس نظریے کا ساتھ نہیں دیتی ہیں، بلکہ یہ سوال پیدا کرتی ہیں کہ اگر اصل مقصد شاہ عبدالعزیز سے استفادہ تھا تو راستہ میں اتنا لمبا قیام کیوں کیا گیا؟ اپنے رفیق مولانا امداد علی کی طرح مختصر قیام کے ساتھ منزل مقصود پر توجہ مرکوز کیوں نہیں کیا؟

۱۹۔ مولانا فضل حسین بہاری نے ''الحیاۃ بعد الممات'' کے ص ۲۸ پر ایک کتاب کے ۹ روپئے میں فروخت کرنے کی بات لکھی ہے، جو کہ اس وقت کے حساب سے بعید از قیاس لگتی ہے۔ مولانا نوشہروی نے ۹ روپئے میں سواری کا گھوڑا بیچ کر ایک کتاب خریدنے کی بات لکھی ہے (تراجم علمائے حدیث ہند: ۱۳۶)

۲۰۔ اس مسجد کے نام کی وضاحت نہیں ملتی ہے، انہوں نے اپنے ایک شاگرد مولوی عبدالعزیز کے نام ایک خط میں اس کا محل وقوع جمنا کے کنارے بتایا ہے (مکاتیب نذیریہ: ص ۹۷، خط نمبر ۷۸)۔

بعد دائرہ شاہ اجمل میں منتقل ہوگئے۔ یہاں پر ان کا قیام سات یا آٹھ مہینہ تھا۔ اس دوران انہوں نے علم نحو وصرف کی مراح الارواح، زنجانی، نقود الصرف، شرح مرآۃ عامل، مصباح اور ہدایۃ النحو وغیرہ کتابیں یہاں کے علماء سے پڑھیں[۲۱]۔ اس عرصے میں مولانا زین العابدین سے استفادہ اور دائرے کے کچھ ساتھیوں سے مذاکرہ علمی کا تذکرہ انہوں نے اپنے ایک خط میں کیا ہے[۲۲]۔ اس کے بعد وہ وہاں سے نکل کر موضع کوڑا (ضلع فتح پور) ہوتے ہوئے ۵/رجب ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) کو کانپور کے موضع خواجہ پھول، تھانہ سکندرہ، تحصیل بھوگنی پور پہونچے اور قلعہ کی مسجد میں ٹھہرے۔ اس مسجد کی جنوبی دیوار پر اپنے پہونچنے کی مذکورہ تاریخ رقم کی تھی[۲۳]۔ پھر یہاں سے قنوج کے قصبہ چھبرامئو گئے اور قاضی محمد بدرالدین کے یہاں ٹھہرے۔ کچھ دن یہاں قیام کر کے قاضی صاحب کے داماد ڈپٹی منظور احمد کے یہاں قصبہ صمدن ضلع فرخ آباد گئے[۲۴]۔ یہاں سے دہلی کا فاصلہ ۳۰۷ کلومیٹر رہ جاتا ہے لیکن نہ جانے کس وجہ سے پانچ سال بعد دہلی پہونچتے ہیں۔ یہ عرصہ دراز کہاں گزرا، کیا مشغولیت رہی۔ مولانا فضل حسین بہاری کے مطابق یہ سب کچھ تاریکی میں ہے۔ انہوں نے ان کی کان پور آمد کا ذکر دو مرتبہ کیا ہے۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادی ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) میں ان کا الہ آباد سے دہلی کے لیے روانہ ہونے کی بات لکھی ہے[۲۵]۔ عظیم آبادی کے اس بیان اور میاں صاحب کا ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) میں کانپور کے موضع خواجہ پھول میں ہونے کی وضاحت کے درمیان تطبیق کی صورت یہی ہے کہ وہ قصبہ صمدن سے دوبارہ الہ آباد جاتے ہیں[۲۶] اور پھر وہاں سے ۱۲۴۲ھ میں دوبارہ دہلی کے لیے نکلتے ہیں اور بقول مولانا فضل حسین بہاری آہستہ آہستہ راہ بے راہ سفر کرتے وٹھہرتے ہوئے ۱۳/رجب ۱۲۴۳ھ (۳۰/جنوری ۱۸۲۸ء) کو دہلی

۲۱۔ الحیاۃ بعد الممات: ص ۲۸، غایۃ المقصود فی شرح سنن ابی داؤد: ۱/۵۱۔۵۲

۲۲۔ نذیر حسین محدث دہلوی، مکاتیب نذیریہ، مرتب: محمد عبدالرؤف، محبوب المطابع، مچھلی والاں دہلی، ب۔ت، ص ۷۹ (خط نمبر ۷۸)

۲۳۔ مکاتیب نذیریہ: ص ۶۱، خط نمبر ۵۳

۲۴۔ ماخذ سابق: ص ۶۳، خط نمبر ۵۶

۲۵۔ غایۃ المقصود فی شرح سنن ابی داؤد: ۱/۵۲

۲۶۔ واضح رہے کہ قصبہ صمدن سے الہ آباد کی یہ واپسی کب اور کیوں ہوتی ہے اس بات کی وضاحت کہیں بھی موجود نہیں ہے۔

پہونچتے ہیں اور اپنے ایک ہم وطن کے ساتھ مولوی شجاع الدین کے گھر پر ٹھہرتے ہیں۔ پھر پندرہ دن بعد پنجابی کٹرہ کی مسجد اورنگ آبادی میں مولانا عبدالخالق کے درس میں شامل ہوتے ہیں اور ان کے گھر پر سکونت اختیار کرتے ہیں [۲۷]۔

دہلی میں انہوں نے پہلے مختلف اساتذہ سے علوم عقلیہ کا درس لیا اور اس کے بعد علوم نقلیہ پر توجہ مرکوز کی۔ کافیہ، قطبی، مختصر معانی، شرح وقایہ، نور الانوار اور حسامی کا درس مولانا عبدالخالق سے لیا۔ مولانا شیر محمد قندھاری سے اصول اکبری، شرح جامی، حاشیہ عبدالغفور، زواہد ثلاثہ، صدرا اور شمس بازغہ پڑھی۔ شرح سلم، شرح قاضی مبارک اور شرح المطالع مولانا جلاالدین ہروی سے پڑھی۔ المطول، التوضیح والتلویح، مسلم الثبوت، تفسیر بیضاوی اور الکشاف مولوی کرامت علی اسرائیلی سے پڑھی۔ مولوی محمد بخش عرف تربیت خاں سے خلاصۃ الحساب، بہاء الدین آملی کی قوشجی، شرح چغمنی اور تشریح الافلاک پڑھی۔ مقامات حریری وحمیدی اور دیوان المتنبی کا کچھ حصہ مولوی عبدالقادر رامپوری سے پڑھا۔ اس طرح پانچ سال میں مذکورہ بالا مختلف علوم عقلیہ ورسمیہ کی تحصیل مکمل کی [۲۸]۔ جبکہ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں نے ساڑھے تین سال میں علوم رسمیہ سے فراغت حاصل کی تھی [۲۹]۔ مولانا فضل حسین بہاری نے اس کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ جب وہ دہلی پہونچے تو انہیں صرف ہدایۃ النحو تک کی ہی صلاحیت تھی اور اتنی استعداد پر انہیں مولانا اسحاق کے درس میں شمولیت کی اجازت نہیں مل سکتی تھی، اس لیے انہوں نے پہلے مولانا عبدالخالق کے حلقہ درس کو لازم پکڑا [۳۰]۔

مولانا فضل حسین بہاری کی یہ بات خلاف قیاس ہے کہ ایک علم کا متلاشی سات سال تک کتابوں کا بستہ لے کر مختلف علاقوں کے علماء سے استفادہ کرنے کے بعد بھی ہدایۃ النحو سے آگے نہ بڑھ سکا۔ الحیاۃ بعد الممات کے صفحہ ۲۸ پر الہ آباد کی تعلیم کے ضمن میں شرح مرآۃ عامل اور مصباح وغیرہ کے پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ الغرض یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انہوں نے مولانا عبدالخالق کے حلقہ درس میں رہ کر پہلے

۲۷۔ الحیاۃ بعد الممات: ص ۳۰

۲۸۔ غایۃ المقصود فی شرح سنن ابی داؤد: ۱/۵۲۔ یہی مدت مولانا عبدالحی لکھنوی نے بھی لکھی ہے۔ دیکھیں نزھۃ الخواطر ۸/۱۳۹۱

۲۹۔ الحیاۃ بعد الممات: ص ۳۶-۴۰

۳۰۔ ماخذ سابق: ص ۴-۳۳

ساڑھے تین سال تک مختلف علماء سے علوم عقلیہ کا درس لیا اس کے بعد کتاب وسنت کی طرف متوجہ ہوئے اور مولانا عبدالخالق کے ساتھ شاہ محمد اسحاق کے درس کو لازم پکڑا اور ان کے مکہ ہجرت کرنے تک ۱۲ یا ۱۳ سال تک استفادہ کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی ایک قلمی یادداشت [۳۱] مورخہ ۱۱ر محرم ۱۲۹۲ھ میں شاہ صاحب سے استفادہ کے متعلق لکھا ہے کہ میں نے صحیح بخاری ومسلم، ہدایہ، کنزالعمال اور جامع صغیر کا پانچواں و چھٹاں حصہ شاہ محمد اسحاق سے پڑھا ہے۔ شاہ صاحب بخاری کا درس صبح میں دیتے اور مولانا عبدالخالق صاحب شام میں پڑھاتے تھے۔ اس لیے میں شام میں ہی شاہ صاحب کا اگلا درس مولانا عبدالخالق سے پڑھ لیتا تھا اور صبح ان کے درس میں حاضر ہوکر سماعت کے ساتھ شکوک کو دور کر لیتا۔ اس طرح پہلی دفعہ مولانا عبدالخالق نے ۷ ماہ میں اور شاہ صاحب نے ۹ ماہ میں بخاری کا درس مکمل کیا۔ [۳۲]

چوں کہ وہ فطرتاً کافی ذہین اور کتب بینی کے شوقین تھے، انھیں علوم عقلیہ ونقلیہ کی مختلف کتابوں کے حوالے ازبر تھے۔ اس لیے شاہ صاحب نے ان کی فقہی بصیرت اور علمی گہرائی کو دیکھتے ہوئے دوران طالب علمی میں ہی انہیں فتوی نویسی پر مقرر کیا تھا۔ اپنی قلمی یادداشت میں انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ شاہ صاحب سے استفادہ کے دوران میں نے سیکڑوں فتوے لکھے ہیں۔ بعض دفعہ تو انہوں نے بطور امتحان مجھ سے کچھ فتاوے کے جوابات لکھوائے [۳۳]۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے شاہ محمد اسحاق کے پاس ولد زنا کے متعلق سوال آیا تو انہوں نے اس کا جواب طلبہ کے حوالے کردیا، لیکن اس کا جواب میاں صاحب کے سوا کسی نے نہیں لکھا۔ اس جواب کو پڑھنے کے بعد شاہ صاحب نے خوشی کے عالم میں کہا کہ بڑا تیز لڑکا ہے اس سے تو وہابیت کی خوشبو آتی ہے [۳۴]۔

میاں صاحب نے اگرچہ چند سالوں میں شاہ صاحب سے کتاب وسنت کا درس مکمل کرلیا تھا لیکن ان کے مکہ ہجرت کرنے تک ان سے استفادہ کا سلسلہ جاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی ان سے سند فراغت یا اجازت حدیث نہیں مانگی۔ لیکن شاہ صاحب ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں جب اپنے اہل

۳۱۔ یہ قلمی یادداشت مولانا فضل حسین بہاری کے پاس موجود تھی جسے انہوں نے ''الحیاۃ بعد الممات'' کے صفحہ ۳۹ تا ۴۱ پر ہو بہو نقل کیا ہے۔

۳۲۔ الحیاۃ بعد الممات: ص ۴۱

۳۳۔ ماخذ سابق

۳۴۔ الحیاۃ بعد الممات: ص ۴۳

وعیال کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ جانے لگے انہیں سند اجازت حدیث لکھ کر دیا[۳۵]۔

شاہ محمد اسحاق سے ان کے تلمذ کا مسئلہ: شاہ محمد اسحاق کے مکہ ہجرت کر جانے کے بعد میاں صاحب کے کچھ ہمعصروں نے ان کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیا کہ انہوں نے شاہ محمد اسحاق سے جھوٹی شاگردی لے رکھی ہے۔عوام میں اس شوشہ کے پھیلانے کی بنیادی وجہ میاں صاحب کی روز افزوں شہرت کے سوا کچھ اور بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔اس تعلق سے مولانا سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

> مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کی شاگردی کا مسئلہ بھی اہل حدیث و احناف میں مابہ النزاع بن گیا ہے۔احناف انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے صرف تبرکاً اجازت حاصل تھی اور اہل حدیث ان کو حضرت شاہ صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں۔ مجھے نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا جس میں بتصریح مذکور ہے کہ ۱۲۴۹ھ میں شاہ صاحب کے درس حدیث میں وہ داخل تھے...[۳۶]۔

ازدواجی زندگی: میاں صاحب کے سالے مولانا عبدالقادر بن مولانا عبدالخالق کے نواسے بشیر الدین احمد مصنف واقعات دارالحکومت دہلی نے ان کی شادی کے متعلق لکھا ہے کہ شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب کے ایماو مشورہ سے ان کی شادی میرے نانا کی بہن یعنی مولانا عبدالخالق کی لڑکی سے ہوئی[۳۷]۔میاں صاحب کا بیان ہے کہ دہلی آمد کے چھٹیں سال[۳۸] (۱۲۴۸ھ بمطابق ۱۸۳۳ء) میں ان کی شادی مولانا عبدالخالق کی لڑکی سے ہوئی۔نکاح شاہ محمد اسحاق نے پڑھایا اور شاہ محمد یعقوب گواہوں میں سے تھے[۳۹]۔

دہلی آمد کے بعد ان کا قیام مولانا عبدالخالق کے مکان میں تھا۔شادی کے بعد بھی تقریباً ۱۸۵۷ء تک ان کا قیام سسرال میں ہی تھا۔لیکن بعد میں وہ کرایہ کے مکان میں منتقل ہو گئے اور پوری زندگی اسی

۳۵۔ماخذ سابق:ص ۴۵

۳۶۔ندوی،سید سلیمان۔حیات شبلی۔اعظم گڑھ:دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی،۲۰۰۸ء۔ص ۶۸

۳۷۔دہلوی،بشیر الدین احمد۔واقعات دارالحکومت دہلی۔۲/ ۲۵۸

۳۸۔اس بات پر سبھی کا اتفاق ہے کہ میاں صاحب ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۸ء) کو دہلی پہونچے تھے اس حساب سے چھٹاں سال ۱۲۴۸ھ بنتا ہے۔بشیر الدین احمد نے ان کی شادی کا جو سال لکھا ہے اسے ہم سہو یا کاتب کی غلطی پر محمول کر کے اسی دوسرے سن کو صحیح مانیں گے کیوں کہ یہ صاحب معاملہ کا بیان ہے۔

۳۹۔الحیاۃ بعد الممات:ص ۴۰

کرایہ کے مکان میں گزاردی۔ اللہ نے انہیں ایک بیٹا شریف حسین اور ایک بیٹی [۴۰] سے نوازا تھا۔ بیٹا علم وفضل میں ان کا جانشین تھا لیکن مشیت الٰہی کے مطابق ان کی زندگی میں ہی ۱۳۰۴ھ کو مولوی عبدالسلام اور مولوی ابوالحسن نامی دو صاحبزادوں کو چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

راولپنڈی کی جیل میں: معرکہ امبیلا (۱۸۶۳ء) میں تحریک مجاہدین کو شکست دینے کے بعد برطانوی سرکار نے اس کے متحرک کارکنوں، بقول مولانا مسعود عالم ندوی، ''بدنام وہابی مبلغوں'' [۴۱] کے خلاف حکومت کے خلاف سازش کا الزام لگا کر ان پر انبالہ، پٹنہ، مالدہ اور راج محل میں کل پانچ مقدمے چلائے اور سخت سزاؤں کے ساتھ ان کے گھروں اور علاقوں کو بھی نیست ونابود کیا [۴۲]۔ اس کے پہلے اور دوسرے مقدمے (۱۸۶۴-۱۸۶۵ء) کے ضمن میں میاں صاحب کے بھی گھر کی تلاشی لی گئی اس کے بعد پوچھ تاچھ کے لیے انہیں راولپنڈی لے جایا گیا۔ دوران تفتیش انہیں وہیں جیل میں قید رکھا گیا۔ ان کی اس گرفتاری اور رہائی کے متعلق ڈاکٹر قیام الدین احمد نے لکھا ہے:

> ...امید علی کے بیان نے نذیر حسین کو یہ کہہ کر صاف صاف ملوث کردیا کہ فیروز شاہ کے قاصد آئے تھے تو وہ بھی موجود تھے۔ نذیر حسین کے گھر کی تلاشی سے بہت سے مشتبہ قسم کے خطوط نکلے۔ ان میں سے بعض وہابیوں جیسے جعفر تھانیسری اور مبارک علی عظیم آبادی کے خطوط بھی نذیر حسین کے نام تھے۔ ایک خط نذیر حسین کا لکھا ہوا سرحد کے وہابی سردار عبداللہ کے نام بھی تھا۔ ریلی نے ضابطہ نمبر۳ کے تحت ان کی گرفتاری کی سفارش کی لیکن وہ ایک معروف ومشہور عالم تھے، اور ان کے خلاف کسی اطمینان بخش شہادت کے بغیر حکومت اس انتہائی اقدام سے متامل تھی۔ حکومت نے اس معاملے کی رپورٹ حکومت پنجاب کو (جس کے تحت خطہ

۴۰۔ بشمول بشیر الدین احمد کسی بھی تذکرہ نگار نے ان کی بیٹی یا کسی بھی جنس اناث کا نام لکھنے کے بجائے ان کا تذکرہ رشتوں سے جوڑ کر کیا ہے۔ اس رازداری کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

۴۱۔ ندوی، مسعود عالم، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، لاہور: مکتبہ چراغ اسلام، طبع ثالث، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۰

۴۲۔ اس تحریک اور اس کے کارکنوں پر کئے گئے ظلم وستم کی تفصیل جاننے کے لئے دیکھیں: ''ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک''، از مسعود عالم ندوی، ''سیرت سید احمد شہید'' اور ''جب ایمان کی باد بہاری چلی'' از ابوالحسن علی ندوی، ''سید احمد شہید''، ''جماعت مجاہدین''، ''سرگزشت مجاہدین'' از غلام رسول مہر اور ''ہندوستان میں وہابی تحریک'' (اردو) مترجم پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی۔

دہلی تھا) بھیج دی اور درخواست کی کہ وہ جو اقدام مناسب سمجھے کرے۔حکومت پنجاب نے ان کو احتیاطی طور پر چھ ماہ جیل میں قید رکھنے کا حکم نافذ کیا مگر اس کے فوراً بعد ہی انہیں رہا کر دیا گیا[۴۳]۔

تواریخ عجیب میں لکھا ہے:

جس زمانے میں (۱۸۶۵ء) وہابیوں پر مہم امبیلا کے نتیجہ میں مقدمے چل رہے تھے تو میاں نذیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہ وہابیان احتیاطاً راولپنڈی جیل میں نظر بند رکھا گیا۔میاں نذیر حسین کے یہاں سے مختلف حضرات مولوی محمد جعفر تھانیسری (تین خط)، مبارک علی ساکن پٹنہ (دو خط)، عطاء اللہ (میرٹھ) محمد عثمان (کانپور)، امین الدین (کلکتہ)، ابوسعید محمد حسین بٹالوی (امرتسر)، محمد سوداگر (المورہ) کے خطوط برآمد ہوئے۔خود میاں صاحب کے خطوط کی نقول ملیں، جو مختلف حضرات کو لکھے گئے تھے۔بہادر شاہ ظفر دہلی کے غدر ۱۸۵۷ء کے دوران کے پانچ فرمان نکلے۔ان تمام مواد کی نہایت غور سے تحقیق کی گئی۔نتیجہ یہ نکلا کہ میاں صاحب کا جہاد کی تحریک سے کوئی واسطہ نہیں تھا[۴۴]۔

الغرض ایک سال کی تفتیش کے بعد جب حکومت کو اطمینان بخش ثبوت نہیں ملا تو انہیں رہا کر دیا۔ مولانا فضل حسین بہاری، امام یحیٰی خاں نوشہروی، علامہ عبدالحی لکھنوی اور مولانا محمد اسحاق بھٹی وغیرہ نے ان کے قید کی مدت تقریباً ایک سال لکھی ہے۔دوران قید انہوں نے حکومت سے سرکاری کتب خانہ سے کتابیں منگا کر مطالعہ کی اجازت حاصل کر لی تھی۔اس کے بعد بے خوف ہو کر جیل میں ہی بخاری کا درس دیتے اور اس سے جب فرصت ملتی تو کتب بینی میں مشغول ہو جاتے۔

ذریعۂ معاش: ان کی زندگی کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ شاہی دربار سے لے کر قوم کے کمزور و نادار لوگوں سے ان کے اچھے روابط تھے۔لیکن انہوں نے کسی کی نوکری یا غلامی نہیں کی۔بلکہ خودداری و استغنائیت کے سبب جوانی و پیرانہ سالی کے ایام غربت و تنگدستی میں گزار دیے۔ان کا پورا دن کتاب و سنت کی تدریس اور مستفتیوں کے سوالات کے جوابات لکھنے میں ختم ہو جاتا اور رات سونے کے ساتھ عبادت و ریاضت میں گزرتی تھی۔اس لیے خوشحال شاگردوں، معتقدین و متوسلین کے

۴۳۔احمد، قیام الدین، مترجم پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی۔ ہندوستان میں وہابی تحریک۔ پاکستان: نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع سوم، ۱۹۸۰ء۔ص ۳۱۵

۴۴۔ تھانیسری، محمد جعفر۔تواریخ عجیب یعنی کالا پانی، مرتبہ: محمد ایوب قادری ایم.اے.، سلیمان اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۲ء،ص ۲۶۳

ہدایا و تحائف کے علاوہ بظاہر ان کے کسی اور ذریعۂ معاش کا سراغ نہیں ملتا ہے[45]۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ چوں کہ وہ مسجد اورنگ آبادی میں اذان و امامت کے ساتھ متولی کا بھی فریضہ انجام دیتے تھے، اور یہ دستور رہا ہے کہ بڑی مساجد کے اماموں کو حکومت یا مسجد کے اوقاف کمیٹی کی جانب سے تنخواہ ملتی تھی، اس لیے ہوسکتا ہے وہ بھی اسی زمرہ میں رہے ہوں جس کے سبب روزگار کی جستجو سے بے فکر تھے۔ اپنے ایک خط میں خود کو فقیر اور بوریا نشین سے خطاب کرتے ہوئے خزانہ غیب سے اپنی امداد کا ذکر کیا ہے[46]۔ یہ اس بات پر دال ہے کہ ان کی آمدنی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ضرور تھا اگرچہ تذکرہ نگاروں نے اسے واضح نہیں کیا ہے۔

سفر حج: علم و فضل کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے اور عمر کی منتہی پر پہونچنے کے بعد ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۳ء) میں انہوں نے حج کا ارادہ کیا اور وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے برطانوی کمشنر دہلی جے۔ ڈی۔ ٹریملٹ اور مسٹر لیسنس سے دو الگ الگ حفاظتی خط[47] لکھوائے پھر انہیں لے کر مکہ روانہ ہوئے۔ جیسے ہی گھر سے روانہ ہوئے مخالفین مستعدی سے ان کے پیچھے پڑ گئے۔ ممبئی میں انہیں گھیر کر ان پر من گڑھت سوالوں کی بوچھار کردی گئی جن کے متعلق انہوں نے اعلانیہ کہا کہ یہ تو مجھ پر بہتان ہے۔ اس کے بعد جب جہاز پر سوار ہوئے تو شورش پسندوں کی جماعت بھی ان کے ساتھ ہولی، اور پورے راستے میں انہیں نقصان پہونچانے کی بڑی کوششیں کیں لیکن انگریز حکام کا خوف کھائے جاتا تھا۔ مکہ پہونچنے کے بعد مخالفین کے ساتھ مل کر ہندی مہاجروں نے ان کے خلاف افواہ پھیلائی اور مختلف الزامات کے ساتھ انہیں وہابیوں کا سرغنہ بتایا، ان کی کچھ کتابوں اور فتاوے کا غلط ترجمہ کرکے عثمانی حکام اور شریف مکہ کو بدظن کیا گیا۔ اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ ان کے خلاف مکہ میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے سرگرم اور با اثر ذمہ داران میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا عبدالقادر بدایونی اور مولانا خیرالدین کا نام سرفہرست ہے۔ اس کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی بھی طرح انہیں قتل یا عمر قید کرادیا جائے۔ منیٰ کے اندر ان کے قتل کی کوشش ہوئی، ان کی پوری جماعت کو خوف زدہ کیا گیا۔ لیکن مشہور مثل جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کے مطابق ان کی ساری سازشیں ناکام ہوئیں۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ انہیں اور ان کے دو جاں نثاروں کو شریف مکہ نے گرفتار کرکے کئی دن تک پوچھ تاچھ کی لیکن برطانوی قونصل کے دباؤ

۴۵۔ الحیاۃ بعد الممات: ص ۲۱۵

۴۶۔ مکاتیب نذیریہ، خط نمبر ۱۱۸، ص ۱۱۹

۴۷۔ یہ دونوں خطوط ''الحیاۃ بعد الممات'' کے صفحہ ۴-۸۳ پر نقل کئے گئے ہیں۔

میں نو دن بعد رہا کر دیا۔اس کے بعد مدینہ کی زیارت کرتے ہوئے وہ ہندوستان واپس آئے۔

اس سفر میں انہیں اور ان کے قافلہ کو کن کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور انگریز حکومت نے کس طرح سے ان کی نگرانی کی ہے ان تمام باتوں کی جھوٹی و سچی تفصیلات اور افواہیں اس وقت کے اخبارات مثلاً قیصر الہند، اشاعۃ السنۃ، نصرت السنۃ اور تحفہ حق وغیرہ میں شائع ہوئی ہیں۔ان کے علاوہ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیں آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی بروایت ملیح آبادی اور الحیاۃ بعد المماۃ۔

شمس العلماء کا خطاب: برطانوی حکومت نے انہیں ۲۱ر محرم ۱۳۱۵ھ (۲۲ر جون ۱۸۹۷ء) کو اس وقت کے سب سے بڑے خطاب ''شمس العلماء'' سے نوازا[۴۸]۔میاں صاحب کو انگریز سرکار نے یہ خطاب کیوں دیا؟ اس کی کوئی واضح اور معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔مثبت نظریہ رکھنے والے مداحین کا ماننا ہے کہ ان کی علمی شہرت اور عوام کے محبوب نظر ہونے کی وجہ سے انہیں یہ خطاب ملا۔جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ میاں صاحب اور ان کی جماعت کو بدنام کرنے کے لیے انگریزوں نے یہ خطاب دیا تھا۔وہیں دوسری طرف مخالفین کا ماننا ہے کہ یہ انگریزوں کے وفادار تھے، ۱۸۵۷ء کے ''غدر'' میں انہوں نے مسز لیسن (ایک انگریز خاتون) کی جان بچائی تھی جس کے صلے میں یہ اعزاز ملا تھا۔لیکن یہ وجہ چند وجوہ سے مانع تسلیم ہے، پہلی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک مسز لیسن کی جان بچانے کی بات ہے تو انہیں اس کا صلہ فوراً ہی ۱۱۰۰ روپئے[۴۹] مع ایک تصدیق نامہ مل گیا تھا۔اور حکومتیں ایسا انعام ایک ہی دفعہ دیتی ہیں۔دوسری وجہ یہ ہے کہ انگریزوں کی نظر میں بدنام وہابی ان کے سب سے بڑے دشمن اور دہشت گرد تھے، اور میاں صاحب کو وہابیوں کا سرغنہ کہا جاتا تھا، اسی بنا پر انہیں ایک سال قید میں بھی رکھا گیا۔اس لیے قیاس اس بات سے مانع ہے کہ کوئی اپنے دشمنوں کے سردار کو اعزاز سے نوازے۔

اس اعزاز کے ملنے کی جو بھی وجہ رہی ہو، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میاں صاحب نے اسے قبول کیا۔اگرچہ اس کے تئیں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی۔بقول بشیر الدین احمد جب انہیں اس اعزاز کی خبر ملی تو انہوں نے کہا ''میاں خطاب سے کیا ہوتا ہے ہمارے لیے پورا خطاب قرآن مجید میں حنیف

۴۸۔الحیاۃ بعد المماۃ: ص ۱۰۲

۴۹۔مولانا فضل حسین بہاری نے اس رقم کی مقدار ۱۳۰۰ روپئے لکھی ہے (الحیاۃ بعد المماۃ: ۸-۷۷)۔یہ رقم کمشنر دہلی کی انگریزی عبارت کے خلاف ہے کیوں کہ اس میں ۴۰۰ اور ۷۰۰ ملا کر کل ۱۱۰۰ کی رقم کا ذکر ہے۔لیکن اس کے اردو ترجمہ میں ۱۳۰۰ کا ذکر یا تو غلط ترجمانی کے سبب ہے یا کاتب نے سہواً لکھ دیا ہے۔

مسلم موجود ہے۔ دنیاوی خطاب سلاطین سے ملا کرتا ہے، یہ گویا ان کی خوشنودی کا اظہار ہے۔ مجھے کوئی نذیر کہے تو کیا! شمس العلماء کہے تو کیا! میں نہایت خوش ہوں کہ ہر ایک میاں صاحب کہتا ہے۔ بھائی سادات کے لیے اس سے بڑھ کر پیارا لفظ نہیں، اس لفظ کی برکات سے میری دوررویشانہ طرز میں فرق نہ آئے بس یہی خدا کا فضل ہے''۔[۵۰]

مولانا فضل حسین بہاری نے لکھا ہے کہ ''اس وقت انہوں نے کہا ہم غریب آدمی خلعت وخطاب لے کر کیا کریں گے! خلعت وخطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیے ہم کو دینا لاحاصل ہے۔ بعد اس گفت وشنید کے آپ نے اس قدر فرمایا: اچھا صاحب آپ حاکم ہو جو چاہو کہو''۔[۵۱]

وفات: کبرسنی اور گھٹنوں میں تکلیف کے سبب وفات سے دس ماہ قبل صاحب فراش ہو گئے تھے۔ ان کے نواسے بشیر الدین احمد[۵۲] ان آخری ایام کے متعلق لکھتے ہیں:

> مرض الموت میں مجھے کئی دفعہ میاں صاحب کی قدم بوسی کا اتفاق ہوا، بجز کبرسنی کے کوئی خاص مرض نہیں تھا۔ پلنگ پر لیٹے رہتے تھے اور ہاتھ میں تسبیح رہتی تھی۔ ہر وقت عالم بے خودی اور استغراق کا رہتا تھا۔ نماز کے وقت خود ہوشیار ہو جاتے تھے۔ کروٹیں بدلتے اور بے چین ہو جاتے تھے۔ اٹھا کر سہارا دے کر بیٹھا دیا نماز پڑھ لی پھر سکون کی حالت ہو جاتی تھی۔ یہی حال تسبیح وتہلیل کا بھی تھا۔ اگر تسبیح ہاتھ سے چھوٹ گئی بس بے چین ہو گئے، پھر دے دی پڑھنے لگے۔ ۱۰/رجب روز دوشنبہ سر مغرب ۱۳۲۰ھ (۱۳/اکتوبر ۱۹۰۲ء) کو انتقال فرمایا اور شیدی پورے قبرستان میں دفن ہوئے[۵۳]۔

علمی واصلاحی خدمات: (الف) تدریس: تدریس میاں صاحب کا سب سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ زندگی کے آخری دن تک کتاب وسنت کی خدمت کرتے رہیں[۵۴]۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت پانے کے بعد اپنے سسر مولانا عبدالخالق کی زندگی میں ہی ان کی جانشینی قبول کر کے مسجد اورنگ آبادی میں تدریس کا کام شروع کر دیا تھا۔ جلد ہی ہر طرف ان کے

۵۰۔ واقعات دار الحکومت دہلی: ۲/۲۶۰

۵۱۔ الحیاۃ بعد المماۃ: ص ۱۰۳

۵۲۔ یہ میاں صاحب کے سسر مولانا عبدالخالق کے صاحبزادے مولانا عبدالقادر کے نواسے تھے۔

۵۳۔ واقعات دار الحکومت دہلی: ۲/۲۶۱

۵۴۔ مکاتیب نذیریہ، خط نمبر ۱۱۸، ص ۱۱۹

درس کا چرچا ہونے لگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب شاہ محمد اسحاق کا درس اور میاں صاحب کا ان سے استفادہ جاری تھا۔

مولانا فضل حسین بہاری کا کہنا ہے کہ اگرچہ انہوں نے مسجد اورنگ آبادی میں شاہ صاحب کے زمانے میں تدریس کا آغاز کردیا تھا لیکن ان کے باقاعدہ درس کا آغاز شاہ محمد اسحاق کے مکہ ہجرت کرجانے کے بعد ہوتا ہے[۵۵]۔ ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں شاہ صاحب کے مکہ ہجرت کرنے کے بعد میاں صاحب کی شہرت میں چار چاند لگ گیا۔ چشمہ ولی اللہی سے تشنگیٔ علم بجھانے والے جوق در جوق آستانہ نذیری پر حاضر ہونے لگے۔ اور بہت جلد درس نذیری کی شہرت عرب تک پہنچ گئی اور لوگ دہلی کا رخت سفر باندھنے لگے۔ ابتداء میں سات یا آٹھ سال تک صرف نحو وصرف کی کتابیں پڑھاتے تھے، پھر شاہ صاحب کی ہجرت کے بعد تمام علوم وفنون کا درس دینا شروع کیا اور سالوں تک اسی طرح تنہا تمام علوم پڑھاتے رہے۔ بعد میں بقول علامہ شمس الحق عظیم آبادی، ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو کتاب وسنت اور فقہ کی تدریس واشاعت تک محدود کرلیا[۵۶] اور اپنی بقیہ عمر اسی کے لیے وقف کردی۔ ان تینوں علوم میں انہوں نے ایسی مہارت حاصل کی تھی کہ ان فنون کی اکثر کتابیں انہیں ازبر ہوگئی تھیں۔ پوری کتب ستہ کا درس دو سال میں اور جلالین ایک ماہ (رمضان) میں مکمل کرتے تھے[۵۷]۔ اپنے درس کی کیفیت اور مہارت کے متعلق کہا کرتے تھے کہ پہلے میں حدیث انما الاعمال بالنیات کی تشریح دن میں مکمل کرتا تھا، مگر اب وقت بدل گیا ہے۔ اب تو میں ہتھیلی پر سرسوں جماتا ہوں اور پوری کتب ستہ کو گلستاں و بوستاں بنا دیتا ہوں۔ ان کے ایک شاگرد مولانا عزیز احمد نامی کا بیان ہے کہ میں نے کئی بار حضرت سے پوچھا کہ آپ نے صحاح بالخصوص صحیح بخاری کا درس کتنی دفعہ دیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کا بہتر شمار تو اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن جہاں تک میرا حافظہ کام کررہا ہے، میں نے کئی سو بار پڑھایا ہے[۵۸]۔ طلبہ کے علاوہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں عوام الناس کو قرآن کا درس دیتے تھے اور اس کے رموز سے لوگوں کو آگاہ کرتے۔ جب کبھی توحید کا ذکر آتا تو اسے بڑی تفصیل سے بتاتے پھر آخر میں کہتے ”مگر

۵۵۔ الحیاۃ بعد الممات: ص ۴۴

۵۶۔ غایۃ المقصود: ۱/۵۳

۵۷۔ ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے ان کتابوں کی تکمیل کی مدت ایک سال لکھی ہے (تراجم علمائے حدیث ہند: ص ۱۴۳)

۵۸۔ الحیاۃ بعد الممات: ص ۵۴

تم دلی والو یا پیر! یا پیر! ہی کہتے رہے۔ ہائے افسوس! ما قدروا الله حق قدره! چلو صاحبو چلو"[۵۹]۔

انہوں نے اپنی تدریس کے آغاز سے لے کر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے المناک واقعے تک مسجد اورنگ آبادی کو اپنی تدریس کا مرکز بنایا تھا۔لیکن غدر میں جب دلی پوری طرح سے برباد ہوگئی پنجابی کٹرہ کا علاقہ ویران ہوگیا، اکثر آبادی دوسری جگہوں پر ہجرت کرگئی۔ نیز اس واقعے کے معاً بعد ۱۲۷۵-۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹-۱۸۶۰ء) کے بجٹ سیشن میں انگریز حکومت نے پرانی دلی ریلوے اسٹیشن کا سنگ بنیاد رکھا تو پنجابی کٹرہ اور مسجد اورنگ آبادی سمیت آس پاس کے علاقے اس کی زد میں آکر منہدم کر دیے گئے۔اس طرح تقریباً تین سال تک ان کا درس متاثر رہا، اس کے بعد انہوں نے پھاٹک حبش خان میں سکونت اختیار کی اور وہاں کی مسجد میں اپنا درس حدیث دوبارہ شروع کیا اور تا وفات یہیں پر مسند درس کی زینت بنے رہے۔

ان کے پابندی اوقات اور طریقہ تدریس کے متعلق ان کے شاگرد مولانا فضل حسین بہاری لکھتے ہیں کہ وہ وقت کے بڑے پابند تھے،ان کے دن ورات کے اوقات مختلف کاموں کے لیے متعین تھے۔ صبح فجر کے بعد مسجد میں درسِ قرآن کے ذریعہ عوام وخواص کی اصلاح کرتے۔اس کے بعد ۱۱ بجے تک طلبہ علوم نبویہ کو ان کی ضرورت کے حساب سے درس دیتے،جس میں صحیح بخاری کا ایک درس شامل ہوتا تھا۔اس کے بعد ایک گھنٹہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ گھر میں بتاتے اور ٹھیک ۱۲ بجے مسجد میں واپس آجاتے اور ۱۲ یا ۱۳ منٹ کے بعد ظہر کی سنت ادا کرتے، پھر وقت کے لحاظ سے کبھی حدیث کا کوئی مختصر درس دیتے یا تلاوت قرآن میں مشغول ہوجاتے۔اس کے بعد نماز ظہر کی اقامت ہوتی اور ان کے صاحبزادے مولانا شریف حسین امامت کرتے۔نماز سے فراغت کے بعد فقہ کی کتاب ہدایہ کا درس شروع کرتے،اس کی تکمیل کے بعد کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے گھر جاتے اور واپس آکر درس حدیث شروع کرتے اور عصر تک اسی میں مشغول رہتے۔عصر کی نماز کے بعد سے مغرب تک صحیح مسلم کا درس دیتے۔پھر مغرب کی نماز کے بعد گھر جاتے اور دن بھر میں جتنے استفتاء یا خطوط آئے ہوتے ان میں سے پانچ سے بیس تک کا جواب لکھتے۔عشاء کی نماز مسجد میں ادا کرتے اور فوراً گھر چلے جاتے اس کے بعد تہجد کے وقت بیدار ہوکر نماز پڑھتے اور پھر مشکل استفتاؤں کا جواب لکھتے۔یہی ان کا روز کا معمول تھا۔

انہوں نے تقریباً ۶۰ سال تک پورے خلوص کے ساتھ دہلی میں کتاب وسنت کا درس دیا۔اس طویل مدت میں ان سے استفادہ کرنے کے لیے مشرق ومغرب سے علم حدیث کے طلب گار بھاگے

۵۹۔تراجم علمائے حدیث ہند:ص ۱۵۲

چلے آتے۔حبشہ، افریقہ، جزائر، جاوا، سماترا، تونس، کابل، غزنی، قندھار، بخارا، بلخ، یاغستان، ایشیائے کوچک، ایران، خراسان اور دوسرے مقامات سے حدیث کے طلب گار کھنچے چلے آئے جن کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ان میں حافظ محمد بن بارک اللہ لکھوی صاحب تفسیر محمدی، مولانا شمس الحق ڈیانوی صاحب عون المعبود، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی، مولانا محمد حسین بٹالوی صاحب اشاعۃ السنۃ، حافظ عبداللہ محدث غازی پوری، حافظ عبدالمنان وزیرآبادی، مولانا محمد ابراہیم آروی، قاضی طلا محمد پشاوری، امام سید عبد الجبار غزنوی، شیخ عبدالحمید، شیخ اخوان، شیخ شہاب الدین، شیخ عبدالرحیم، مولوی زین العابدین، مولوی محمد حسین، علامہ عبدالحی حسینی صاحب نزہۃ الخواطر اور ملا رجب علی وغیرہ کے نام شامل ہیں[۶۰]۔

(ب) مدرسہ میاں نذیر حسین کا قیام: ۱۲۷۵-۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹-۱۸۶۰ء) میں دہلی ریلوے اسٹیشن بنانے کی غرض سے جب پنجابی کٹرہ کے ساتھ مسجد اورنگ آبادی کو منہدم کر دیا گیا تو میاں صاحب نے اسی کے قریب پھاٹک حبش خان میں سکونت اختیار کی اور وہیں پر ایک مسجد میں درس دینا شروع کیا۔ بعد میں اسی مسجد کے اردگرد انہوں نے طلبہ کی رہائش اور دیگر ضروریات کا انتظام کر کے اسے مدرسہ کا درجہ دیا، جسے آج کل مدرسہ میاں نذیر حسین کے نام سے جانا جاتا ہے۔ان کی وفات کے بعد ان کے پوتے عبدالسلام اور ابوالحسن نے یکے بعد دیگرے مدرسے کی باگ ڈور سنبھالی۔ان کے بعد مدرسہ کا معیار روز بروز گرتا گیا اور آج وہ پھاٹک حبش خاں کی تنگ گلیوں میں چند کوٹھریوں پر مشتمل ہے۔

ان کی زندگی میں اس مدرسے کے انتظام و انصرام کی پوری ذمہ داری انہیں کے کندھوں پر تھی۔ان کے شاگرد خاص مولانا تلطف حسین بطور معاون ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔اہل خیر حضرات کے تعاون کے سوا اس مدرسے کی آمدنی وخرچ کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔لیکن اس تعاون میں بھی وہ صرف انہیں لوگوں کے تعاون کو قبول کرتے جو مخلص ہونے کے ساتھ خوشحال ہوتے تھے۔حاجت مندوں اور مسکینوں سے کبھی کوئی تعاون نہیں لیا، بلکہ اگر کوئی چپکے سے دے جاتا تو حقیقت حال سے آگہی کے بعد اسے واپس کر دیتے تھے[۶۱]۔اسی طرح وہ درباری تعاون کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ایک مرتبہ مولانا جمال الدین مدارالمہام نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ اگر ریاست بھوپال کو لکھیں تو اچھا تعاون مل سکتا ہے۔اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ میں اس طرح کی لغو تحریکات سے ہمیشہ بچتا ہوں۔اللہ کے در پر بیٹھ کر

۶۰۔طلبہ کے نام مع علاقہ تفصیل کے لئے دیکھیں ''الحیاۃ بعد المماۃ'' کا ضمیمہ دوم۔

۶۱۔مکاتیب نذیریہ، خط نمبر ۱۱۸، ص ۱۱۹

درس دیتا ہوں، وہ خزانہ غیب سے مدرسہ وطلبہ کی مدد کرتا ہے۔ مجھے اللہ نے امیروں کے دروازے پر جانے سے کراہت عطا فرمائی ہے۔ جو ذات ہمیں یہاں لائی ہے وہ میرے اور طلبہ کی روزی روٹی کے لیے سب کچھ بقدر ضرورت دیتی ہے۔ ایسی صورت میں صبر وقناعت کا دامن چھوڑنا بے وقوفی کا کام ہے[۶۲]۔ جب کبھی مدرسہ میں فاقے کی نوبت آتی تو وہ درباروں کے بجائے اپنے خوشحال وفارغ البال اقارب واحباب کو خط لکھ کر تعاون لیتے تھے[۶۳]۔

ان کے زمانہ میں اس مدرسے کا کوئی متعینہ نصاب نہیں تھا بلکہ طلبہ کی ضرورت کے حساب سے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ اس کے نصاب کے متعلق وہ مولوی سرفراز علی کٹولوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میرے یہاں پیری مریدی کی دوکان نہیں ہے۔ ہاں ایک مدرسہ ہے جس میں خدا اور رسول اللہؐ کے احکام پڑھائے جاتے ہیں۔ خدا کیا ہے اور بندہ کیا ہے، بتایا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی بری باتوں سے بچنا، اچھی راہ پر چلنا اور کسی کو نہ ستانا سکھایا جاتا ہے۔ رقاق کی حدیثیں جو صحاح ومسانید ومعاجم ہیں ان پر عمل کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ جو کوئی شاگرد یا طالب علم حق کی خواہش کرتا ہے تو توبہ بھی کرا لیتا ہوں۔ عموماً اس مدرسہ کا دستور ہے کہ جب تفسیر وحدیث نئے طالب علموں یا صادق خواہش مندوں کو پڑھائی جاتی ہے تو پہلے استغفار وانابت کی نصیحت کرتا ہوں... الخ[۶۴] ان کے یہاں عام طور سے منتہی درجہ کے طلبہ تکمیل علم اور سند اجازہ کے لیے آتے تھے۔ اس کی مدت دو سے تین سال تھی۔

(ج) دعوت وتبلیغ: درس وتدریس کے سوا دعوت وتبلیغ کے فریضہ کو بھی انہوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ حاسدین کی نظریں ہمہ وقت ان کی ایک ایک نقل وحرکت کو محفوظ کرتے ہوئے موقع کی تلاش میں رہتی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے کتاب وسنت کی اشاعت کی خاطر دلی کے ساتھ امرتسر، اتر پردیش، بہار اور بنگال کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ جن کا تذکرہ انہوں نے اپنے مختلف خطوط میں کیا ہے۔

وعظ میں وہ عام طور سے پہلے قرآن کی کوئی چھوٹی سورہ یا آیت تلاوت کرتے اس کے بعد اس کا ترجمہ کر کے اس کی تشریح پہلے قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے کرتے پھر بطور شواہد احادیث نبویہ کا ذکر کرتے اور عام فہم زبان میں اس کے مسائل کو اس انداز میں بیان کرتے کہ اس کا اثر سیدھا سامعین کے دل پر ہوتا۔

۶۲۔ مکاتیب نذیریہ، خط نمبر ۷، ص ۱۷

۶۳۔ مکاتیب نذیریہ، خط نمبر ۹۲، ص ۹۸

۶۴۔ مکاتیب نذیریہ، خط نمبر ۲۳، ص ۱۲

دعوت وتبلیغ کے ضمن میں ان کا ایک بڑا کام فتوی نویسی اور خطوط نگاری کا ہے۔دوران طالب علمی سے لے کر آخر عمر تک انہوں نے حالات کی خبر گیری کے ساتھ دعوتی و اصلاحی خطوط بھی لکھے۔ان کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے استفتاءات کے جواب اور فتاوی لکھے۔ان فتووں کی تعداد کتنی ہے اس کا صحیح اندازہ کسی کو نہیں ہے۔مولانا فضل حسین بہاری نے اس سے متعلق ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے وفات سے ۲۷ سال پہلے ایک دفعہ باتوں باتوں میں کہا کہ اگر میرے سارے فتاویٰ کی نقل محفوظ رکھی گئی ہوتی تو آج کم سے کم چار فتاویٰ عالمگیری تیار ہو جاتی۔اس حساب سے اگر وفات تک کے فتووں کی ضخامت کا اندازہ لگایا جائے تو انہیں پندرہ،بیس جلدوں سے کم نہیں ہونا چاہئے جبکہ فتاویٰ نذیریہ کے نام سے ان کے جو فتاوے اہل حدیث اکادمی، کشمیری بازار، لاہور سے ۱۹۷۱ء میں دوسری بار شائع ہوئے ہیں وہ کل تین جلدوں میں ہیں۔[۶۵]

(د) تصنیف وتالیف: عام طور سے لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ انہیں تدریس میں اس قدر انہماک اور دلچسپی تھی کہ تصنیف وتالیف کا موقع ہی نہ ملا۔ان کی صرف ایک مستقل کتاب ہے جسے معیار الحق کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کے علاوہ فتاویٰ نذیریہ ان کے فتاوے کا مجموعہ ہے۔لیکن ان کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری نے الحیاۃ بعد الممات میں چھوٹی بڑی ۵۷ تصانیف و رسائل کا تذکرہ کیا ہے[۶۶]۔جن میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ الایمان یزید وینقص

۲۔ پیری مریدی

۳۔ سماع وغنا ومزامیر

۴۔ توثیق عبادۃ بن صامت درقرأت فاتحہ خلف الامام

۵۔ مولانا سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید قابل تعظیم تھے

۶۔ تحقیق حدیث جابر بن سمرۃ در باب رفع الیدین

۷۔ لفظ ما کی تحقیق نسبت ما اھل لغیر اللہ

۶۵۔الحیاۃ بعد الممات:ص ۱۵۲

۶۶۔ماخذ سابق:ص ۲۸۱۔۲۸۲

۸۔ جواب جانور منذور لغیر اللہ

۹۔ جواب مسئلہ استوا

۱۰۔ تقویۃ الایمان کی توثیق

۱۱۔ دیہات میں جمعہ کی نماز

۱۲۔ چلتی ہوئی ریل گاڑی میں نماز

۱۳۔ قرأت فاتحہ خلف الامام کی تحقیق بحوالہ محلّیٰ شرح موطا شیخ سلام اللہ حنفی

ان کی تصانیف میں معیارالحق سب سے زیادہ مشہور اور تنقید کا نشانہ بنی ہے۔ یہ کتاب دراصل مولانا اسماعیل شہید کے رسالہ تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین کے جواب میں لکھی گئی کتاب تنویرالحق [67] کے جواب میں اصول تقلید پر لکھی گئی ہے۔اس میں انہوں نے کسی چیز کی اصلیت کو پرکھنے کے لیے کتاب وسنت کو کسوٹی اور معیار قرار دیا ہے۔اس کے منظر عام پر آنے کے بعد مولانا ارشاد حسین رامپوری نے انتصار الحق کے نام سے اس کا جواب لکھا۔اور اس میں الگ سے بارہ مسائل کو بطور چیلنج پیش کرتے ہوئے لکھا کہ جو بھی شخص ان مسائل کا جواب دے دے گا تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے پوری کتاب کا جواب لکھ دیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی اشاعت کے دوسرے ہی دن مولانا سید امیر حسن سہسوانی نے براہین اثنا عشر کے نام سے اس کا جواب لکھ کر شائع کیا۔اس کے بعد ''تلخیص الانظار فی ما بنی علیہ الانتصار''،اختیارالحق اور بحر ذخار کے نام سے بھی اس کے جواب لکھے گئے۔

خلاصہ بحث : انیسویں صدی عیسوی کے اس مایہ ناز محدث نے درس حدیث کے ساتھ حالات حاضرہ پر بھی گہری نظر رکھی اور مغلیہ دربار میں اپنی الگ پہچان بنائی۔وہ بادشاہ کو بھی غلطی پر بے خوف متنبہ کرتے تھے۔ان کا معیار بلند دیکھ کر حاسدوں کی نظروں نے گھیر لیا۔ پہلے انہیں انبالہ کیس میں ایک سال تک راولپنڈی جیل میں رکھا گیا۔پھر حج کے موقع پر نجدی وہابی اور معتزلی ہونے کا الزام لگا کر بد دین ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔جب ان سے کچھ نہ بنا تو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ نے ہر موقع پر ان کی مدد کی اور عزت سے نوازا۔انہوں نے حالات کے نشیب اور سرد و گرم تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے پورے عزم و استقلال کے ساتھ آخر دم تک کتاب وسنت کے درس کو عام کیا۔

۶۷۔ یہ کتاب مولانا محمد شاہ پاک پٹنی پنجابی نے ترتیب دے کر نواب قطب الدین خاں کے نام سے شائع کیا تھا۔

وفات شبلی پر قطعہ تاریخ اور لوح مزار

ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

azmi408@gmail.com

اردو شاعری میں قطعہ نگاری کا ایک طویل سلسلہ اور بڑا قیمتی ذخیرہ ہے۔اردو شاعری کے تقریباً ہر دور میں اس سے دلچسپی لی گئی۔حالانکہ تاریخیں کہنا کچھ آسان بات نہیں،تاہم شعرانے اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے،چنانچہ اہل ذوق اور صاحب کمال نے اس کی بڑی پذیرائی کی۔اب اس کی تاریخ پر کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور منظوم تاریخوں کے کئی مجموعے بھی چھپ گئے ہیں۔

شعرانے قطعہ نگاری کے ساتھ تاریخی قطعات و مسدس میں بھی طبع آزمائی کی بلکہ زبردست دادسخن دیتے رہے۔ایسے کئی مجموعے راقم کی نظر سے گذرے ہیں،بلاشبہ اس کی اپنی الگ اہمیت وافادیت ہے۔

قطعات تاریخ کے موضوعات متنوع ہیں۔مثلاً تاریخ پیدائش ، تاریخ وفات، شادی، ختنہ، حادثات،سنہ تصنیف وتالیف اور لوح مزار وغیرہ۔

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں دادسخن دی ہے۔ ان کا اردو اور فارسی کا کلیات موجود ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی شاعری کا جو پہلا حوالہ ملتا ہے وہ قطعہ نگاری ہی سے متعلق ہے(حیات شبلی ص ۱۳۱)

ان کے کلیات میں متعدد قطعات شامل ہیں مگر ان میں ایک بھی قطعہ تاریخ نہیں ہے،گویا بعد میں انہوں نے یہ سلسلہ ترک کر دیا تھا،یا ان کی جو بیاضیں غائب ہوئیں،انہی کے ساتھ شاید ان کا وجود بھی مٹ گیا ، البتہ مکاتیب شبلی حصہ اول میں ایک شخص راجندر کی تاریخ وفات پر چند فارسی قطعات تاریخ درج ہیں،جو انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی مہدی حسن بیرسٹر(م:۲۹/جون ۱۸۹۷ء) کی فرمائش پر انہی کی زبان سے کہے ہیں: جو درج ذیل ہیں:

از: زبان مہدی حسن

چو راجندر پرشاد در خاک خفت — کہ غافل ز پیچ و خم مرگ بود
مرا بود سرمایۂ زندگی — وفا با منش تا دمِ مرگ بود
جہانے ز مرگش غمین شد بہ بیں — کہ ہم سال مرگش غمِ مرگ بود

۱۳۰۰ھ

دیگر

آں گراں پایہ یار من راجندر — از جہاں رفت و زیر خاک نہفت
خویشتن از میاں رمید و مرا — خان و ماں شکیب پاک برفت
چارہ چوں نیست جز شکیبائی — خود چہ آید کنوں زگفت و شنفت
از سروصل او تواں بگذشت — گرچہ ایں حرف خود نیارم گفت

۱۸۸۳ء،۱۸۸۹ء

وانگہ سال مرگ او گفتم
کافتابی بزیرخاک نہفت

۱۸۸۳ء ۱۸۸۹ء

(شبلی نعمانی،۱۳/اپریل ۱۸۸۳ء: مکاتیب شبلی اول ص۶۴-۶۵)

خانوادۂ شبلی کے ایک فرد فرحت احمد کے ہاں بھتیجا پیدا ہوا اور علامہ شبلی سے تاریخ کی فرمائش کی گئی تو یہ اشعار کہے:

مرحبا مرحبا لمولود — کہ بود بادہ ایاغ کمال
یاز در پیشگاہ بزم وجود — گشت روشن ازو چراغ کمال
مردم دیدۂ ہنر فرحت — کہ تواں یافت زو سراغ کمال
سال تاریخ را چو امر نمود — گفت شبلی بہار باغ کمال

۱۳۲۰ھ

(مکاتیب شبلی:۱/۷۸)

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس پر یہ توضیحی نوٹ لکھا ہے کہ ''سر وصل یعنی واؤ کا تخرجہ ہے۔مصرعہ تاریخ کا عدد ۱۸۸۹ء ہے اس میں سے و کے تخرجہ کے بعد ۱۸۸۳ء حاصل ہوتا ہے۔

(مکاتیب شبلی ۱؍۶۴، حاشیہ)

مئی ۱۹۰۷ء میں علامہ شبلی کے پاؤں کا حادثہ پیش آیا اور ان کا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا، اس حادثہ پر متعدد شعراء عزیز لکھنوی، وحشت کلکتوی، اقبال سہیل وغیرہ نے قطعات تاریخ اور رباعیاں کہیں۔ پھر ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی کی وفات کا سانحہ پیش آیا تو متعدد شعرا نے جس میں اکبرالہ آبادی، علامہ اقبال، دلگیرا کبرآبادی اور عزیز لکھنوی وغیرہ نامور شعرا کے نام شامل ہیں، تاریخی قطعات اور لوح مزار لکھے جو اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں۔ یہ قطعات اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہے گئے ہیں۔ یہاں قطعات تاریخ اور قطعہ نگاروں کا اجمالی تذکرہ سپرد قلم کیا جاتا ہے۔

سید ابن علی محشرؔ: علامہ شبلی کے سانحہ وفات پر سید ابن علی محشرؔ کا قطعہ تاریخ رحلت ماہنامہ افتخار جاورہ ماہ نومبر ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ یہ ریاست جاورہ ہی کے رہنے والے تھے۔ ان کے مزید حالات معلوم نہ ہوسکے۔

ان کا قطعہ تاریخ رحلت شبلی درج ذیل ہے:

کیا یک بیک دیا ہمیں داغ مفارقت — راہی سوئے عدم ہوئے شبلی نامدار

ہیہات علم وفضل کا گل ہوگیا چراغ — آئی خزاں زمانہ میں رخصت ہوئی بہار

ایسے وحید عصر کی بے وقت موت سے — کیا فائدہ ہوا تجھے اے چرخ کج مدار

ہر سمت آہ ونالہ وشیون کی ہے صدا — مخلوق ہر طرف نظر آتی ہے سوگوار

محشر سروش بادل غم گیں و دردمند

سال وصال گفت ۔ خردمند روزگار

۱۳۳۲ھ

دوسرا قطعہ درج ذیل ہے:

ہوا مرگ شبلی سے اک حشر برپا

قیامت نمایاں ہوئی ہے جہان میں

رقم کرد محشر چنیں سال رحلت
گیا طوطی ہند باغ جنان میں

۱۹۱۴ء

(ماہنامہ افتخار جاورہ، نومبر ۱۹۱۴ء، ص ۲۸-۲۹)

علامہ اقبال: علامہ شبلی اور علامہ اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) ایک دوسرے کے معتقد و مداح تھے۔ خط و کتابت بھی رہی، اس کی تفصیل ناچیز نے اپنی کتاب 'اقبال اور دبستان شبلی' میں قلم بند کی ہے۔

۱۹۱۴ء میں سانحہ وفات شبلی پر متعدد شعرا نے قطعات اور تاریخیں کہیں جو زمیندار لاہور ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں شائع ہوئیں تو علامہ اقبال نے بھی ایک لوح مزار لکھ کر ایک خط کے ساتھ مدیر زمیندار لاہور کو بھیجا، جو ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے علامہ شبلی کے لوح مزار کے متعلق لکھا ہے کہ:

مندرجہ ذیل الفاظ مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے لوح مزار کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہوں گے کہ انھیں سے ان کی تاریخ وفات کا سال بھی نکلتا ہے:

امام الہند شبلی طاب ثراہ
۱۳۳۲ھ

(زمیندار لاہور، ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء)

لیکن اس لوح مزار میں ایک دو لفظ چھوٹ گئے تھے، جس سے تاریخ مکمل نہیں ہو رہی تھی، چنانچہ زمیندار ۱۱؍دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں علامہ اقبال کے لوح مزار کے متعلق مولانا سید علی زینبی امروہوی معلم ادبیات دار العلوم ندوہ نے لکھا کہ:

عنوان بالا سے ۳؍دسمبر [۱۹۱۴ء] کے زمیندار میں جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پی ایچ ڈی نے علامہ (شبلی) مرحوم کے لوح مزار کے لئے جو تاریخ تحریر فرمائی ہے، اس میں ایک مصرعہ کی کمی ہے۔ اس لئے ذیل کا فقرہ تاریخی زیادہ موزوں ہوگا: 　امام الانام شبلی اطاب اللہ ثراہ
۱۳۳۲ھ

مولانا سید علی زینبی کے متوجہ کرنے پر علامہ اقبال نے مدیر زمیندار کو ایک اور خط لکھا، جس میں

انھوں نے اپنے مصرعہ تاریخ کی تصحیح کی۔ دوسرا خط یہ ہے:

میں نے جو جملہ مولانا شبلی کے لوح مزار کے لئے تجویز کیا تھا وہ اصل میں یہ ہے:

امام الہند والانژاد شبلی طاب ثراہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو خط میں نے آپ کو لکھا تھا اس میں میری غلطی سے لفظ ''والانژاد'' تحریر میں نہ آیا اور آپ کے اخبار میں بھی اسی طرح شائع ہوگیا۔ بہرحال میں اپنی فروگذاشت سے خوش ہوں کہ اس وجہ سے مولانا سید علی پروفیسر ادب دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کو ایک ایسا تاریخی جملہ سوجھ گیا جو میرے جملے سے بہت زیادہ موزوں ہے۔ (زمیندار لاہور ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء)

اقبال کے درج بالا دونوں مختصر خطوط غالباً کلیات مکاتیب اقبال میں شامل نہیں ہیں۔

اکبرالہٰ آبادی: شبلی و اکبر میں انتہائی گہرے اور مخلصانہ مراسم تھے۔ اس کا ذکر ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' آچکا ہے۔ لسان العصر سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۱ء) کے کلیات میں علامہ شبلی سے متعلق متعدد اشعار کے علاوہ کئی قطعہ تاریخ بھی درج ہیں:

لفظوں میں اجتماع نہ معنی میں نور ہے
ویران آج کوچہ بین السطور ہے
شبلی کا خامہ صفحہ ہستی سے اٹھ گیا
اب مد آہ و لوح دل ناصبور ہے

شبلی ہی اٹھ گئے تو میں اب جاؤں کس کے پاس
شعر و سخن کی بزم نظر آتی ہے اداس
ڈھونڈا جو دل نے مادہ سال انتقال
پھرنے لگا نگاہ میں یار سخن شناس
۱۳۳۲ھ

کلیات اکبر حصہ سوم ص ۱۵۰، مطبع کریمی الہٰ آباد، ۱۹۴۰ء

ان اشعار کے علاوہ اکبر نے ہفت روزہ زمیندار لاہور ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں ایک اور مادہ

تاریخ ’’فوت مورخ: ۱۳۳۲ھ‘‘ نکالا ہے۔ علاوہ ازیں کلیات اکبر میں درج ذیل قطعہ تاریخ شامل ہے:

تھے مولانا شبلی بے شک اپنے علم وفن میں راسخ
ان کی موت ہے قومی ماتم سال رحلت فوت مورخ

۱۳۳۲ھ

(روز نامہ زمیندار: ۳ر دسمبر ۱۹۱۴ء، نمبر ۲۴۶)

اس مادہ تاریخ کے نیچے ایک خط بھی شائع ہوا ہے، جو غالبًا اکبر ہی کے قلم سے ہے، اس لئے کہ خط سے کسی اور نام کی صراحت نہیں ہوتی، چونکہ اس خط سے بھی ایک مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے، اس لئے یہ پورا خط یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار

سید سلیمان صاحب نے مختصر خط میں آپ کو یہ فقرہ لکھا تھا کہ ’’وہ وقت نہ آئے کہ میں قوم کو یتیمی کا پیغام سناؤں‘‘، عجب اتفاق ہے کہ سید سلیمان کے اسی خیال سے مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے۔ بلا تعمیہ وتخرجہ

قوم یتیم گشت آہ

۱۳۳۲ھ

یہ تاریخ مولانا سید سلیمان صاحب ہی کے الفاظ میں ہے، (شبلی) مرحوم کے اوصاف کی نسبت جو کچھ کہا جائے طبیعت سیر نہ ہوگی:

مراست غم کہ شدم ساکن جحیم فراق
ترا چہ غم کہ بہ سوئے روضہ جناں رفتی

(زمیندار لاہور۔ ۳ر دسمبر ۱۹۱۴ء)

ثاقبؔ: مولوی احسن اللہ خاں: مولوی احسن اللہ خاں ثاقبؔ (۱۸۵۳-۱۹۳۵ء) اور علامہ شبلی کے بڑے خوش گوار مراسم رہے۔ خط وکتابت کا سلسلہ بھی رہا۔ ان کے نام علامہ شبلی کے چھ خطوط ’’گوہرین نامہ‘‘ میں شامل ہیں۔ ثاقب علامہ شبلی کی عظمت اور ادبی کارناموں کے بڑے مداح تھے۔ ’’گوہرین نامہ‘‘ کے صفحات میں جگہ جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔

ثاقب نے علامہ شبلی کی وفات پر فارسی میں دو قطعات تاریخ کہے ہیں۔ یہ قطعات بھی ’’گوہرین

نامہ‘‘ میں شامل ہیں۔اس میں انہوں نے علامہ شبلی کو فاضل وافضل، کامل واکمل، بے مثل اور ناظم ملک سخندانی وغیرہ الفاظ سے یاد کیا ہے۔دونوں قطعات ملاحظہ ہوں:

(۱)

آہ سردفتر ارباب کمال کہ زدفتر کدہ فانی رفت
حاکم محکمہ علم وحکم ناظم ملک سخندانی رفت
فاضل وافضل بے مثل نماند کامل و اکمل لا ثانی رفت
با کمالے کہ تو آگاہی ازو ہمہ دانی کہ تو میدانی رفت
بردل وجان من از رفتن او رنج روحانی وجسمانی رفت
ہمتش بین کہ بیکپائے آخر تا بہ منزل گہ روحانی رفت
راہ داں آمدہ وراہ شناس راہ دشواری بہ آسانی رفت
خاست چوں از سر جان ہاتف گفت مولوی شبلی نعمانی رفت

۱۳۳۲ ہجری

(۲)

اے دل افسانہ ہردر د بگو زان جواں مرد جہاں گرد بگو
کہ سوئے خلد سفر کرد بگو برہ و رسم بر آورد بگو

از سخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

دشمن اہل خرد دوراں شد خالی از علم وعمل گیہاں شد
از ادب وطلبش حرماں شد ملک معنی وبیاں ویراں شد

از سخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

خلقے از چرخ کہن می نالد خلقے از رنج ومحن می نالد
ہر ایک از اہل سخن می نالد درچمن مرغ چمن می نالد

از سخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

دست بیداد فلک باز کشاد حملہ اش کرد اثر لطمہ باد
دفتر علم و ہنر داد بباد قلم از کف علم از پا افتاد

از سخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

۱۹۱۴ء

نواب سید محمد جعفر علی خاں جعفرؔ: نواب سید محمد جعفر علی خاں جعفرؔ خلف نواب سید محمد علی خاں معروف بہ دولہ صاحب رئیس شمس آباد (ضلع فرخ آباد) نے بھی وفات شبلی پر ایک قطعہ کہا ہے، جو ان کی کتاب 'دفتر تاریخ' حصہ ششم میں شامل ہے۔ یہ قطعہ اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس کے پہلے مصرعے میں تاریخ وفات ہندی تاریخ یعنی سمبت میں نکالی گئی ہے۔ دوسرے میں عیسوی، تیسرے میں فارسی اور چوتھے مصرعے میں عربی میں تاریخ کہی گئی ہے۔ جو درج ذیل ہے:

بداز اولاد امام اعظم ایں آتش زبان خیر خواہ ہندیاں دل سوز جملہ مومناں

سمبت ۱۹۷۱ء ۱۹۱۴ء

مرشد کامل مآل اندیش صوفی نجیب رفتہ نزد بوحنیفہ وائے شبلی از جہاں

ف ۱۳۲۴ ۱۳۳۳ھ

حاشیہ میں ایک اور مصرعہ تاریخ ہے جو ہے تو فارسی میں اور اس پر رمز بھی فارسی کا ہے، مگر سنہ کچھ اور ہے۔

تابع احکام احمد دور بیں مرد عقیل

ف ۱۳۲۲

(دفتر تاریخ ۶/۲۹)

علامہ شبلی کے نعمانی لکھنے کی وجہ سے بہت سے اشخاص ان کو امام ابوحنیفہؒ کی نسل سے خیال کرتے ہیں۔ نواب سید محمد جعفر علی خاں کو بھی یہی غلط فہمی ہوئی ہے۔ علامہ شبلی کو اگرچہ امام اعظمؒ سے بے انتہا شیفتگی

تھی، مگر وہ ان کی نسل سے نہیں تھے بلکہ ایک نومسلم راجپوت چودھری سراج الدین کی نسل سے تھے۔

حامد حسن قادری: ناموراديب وشاعراور تاریخی قطعہ نگار حامد حسن قادری (۱۸۸۷-۱۹۶۴ء) سابق صدر شعبہ فارسی واردو سینٹ جانس کالج آگرہ نے بھی علامہ شبلی نعمانی کی تاریخ وفات کہی ہے۔ پہلی تاریخ قرآن مجید کی سورہ نحل کی ایک آیت سے نکالی ہے:

لنعم دار المتقين جنةعدن يدخلو نها/ ۱۹۱۴ء (نحل، رکوع ۴)

اس پر انہوں نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ ’’قرآن مجید کا املا جنت ہے۔ میں نے ۵ عدد لینے کے لئے جنۃ لکھ دیا ہے۔ (جامع التواریخ، ص ۱۴)

ان کے قطعات تاریخ کے دوسرے مجموعہ دفتر تاریخ میں تفصیل اس طرح درج ہے:

تاریخ وفات مولانا شبلی نعمانی

کہ بتاریخ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء بمقام اعظم گڑھ فرمود

(نوشتہ بمقام بچھراؤں ضلع مراد آباد

ناظم۔ناثر۔ادیب۔نقاد

۱۹۱۴ء

بگو شبلی نعمانی ست اندر رحمت سبحاں

۵۶۳ + ۷۶۹ = ۱۳۳۲ء

تاریخ از کلام ایزد

۱۳۳۲ھ

لنعم دار المتقين جنةعدن يدخلو نها

۱۹۱۴ء

(دفتر تاریخ، ص:۷۸)

حفیظ: حفیظ اللہ خاں: حفیظ اللہ خاں حفیظ، موضع سکرور ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جب علامہ شبلی کا انتقال ہوا اس وقت حفیظ حیدرآباد میں مقیم تھے۔ انہوں نے ایک قطعہ میں علامہ شبلی کی تاریخ وفات کہی۔ یہ تاریخی قطعہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کے ہاتھ آیا تو انہوں نے ماہنامہ

معارف میں ایک نوٹ کے ساتھ اسے شائع کرایا۔(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۸۹ء)

حفیظ اللہ خاں حفیظؔ سکروری کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔

قطعہ تاریخ

وفات حسرت آیات علامہ لاثانی جناب مولانا شبلی نعمانی مرحوم مغفور

حسرتا وا حسرتا وا حسرتا
از جہاں فخر جہاں شبلی برفت
بہر تاریخ وفات او حفیظ
گفت رضواں ، در جناں شبلی برفت

۱۳۳۲ھ

طبع زاد: خاکسار حفیظ اللہ خاں حفیظ سکروری اعظم گڑھی
مقیم حیدرآباد دکن

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صاحب نے مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی سابق پروفیسر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے جو اس فن کے بڑے پارکھ تھے، تصدیق کرائی تو انہوں نے حساب لگا کر بتایا کہ تاریخ کا مادہ بالکل ٹھیک ہے۔(ماہنامہ معارف اگست ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۳)

حکیم رحمت بنارسی : حکیم رحمتؔ بنارسی بنارس کے ایک ممتاز شاعر تھے۔علامہ شبلی کی وفات پر کہا گیا ان کا قطعہ تاریخ حاجی محمد عبدالقادر نے اپنی کتاب ''رہنمائے تاریخ اردو'' میں نقل کیا ہے:

اپنا ثانی نہ رکھتے تھے کوئی
فرد و یکتا یگانہ شبلی تھے
مصرعہ سال فوت لکھ رحمتؔ
اوستاد زمانہ شبلی تھے

۱۳۳۲ھ

(رہنمائے تاریخ اردو، ص ۸۱)

دلگیر اکبرآبادی: سید شاہ نظام الدین دل گیر اکبرآبادی (۱۸۸۳-۱۹۳۴ء) اپنے عہد کے ممتاز شاعر و

ادیب تھے، آگرے کے رہنے والے تھے، وہیں تعلیم و تربیت ہوئی اور شعر و ادب کا مذاق پیدا ہوا، جنوری ۱۹۱۳ء میں آگرہ سے ایک ادبی ماہنامہ 'نقاد' جاری کیا، اس کے ابتدائی دو شمارے (جنوری ر فروری ۱۹۱۳ء) علامہ شبلی کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے ایک خط کی صورت میں اپنے تاثرات لکھ کر بھیجے، جو نقاد کے مارچ ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

ڈیڑھ سال بعد (۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو) علامہ شبلی نے وفات پائی تو اسی ماہ یعنی نومبر میں دلگیر نے مولوی سید محمد یوسف قیصر بھوپالی کی نظم 'ماتم شبلی' شائع کی، بعد ازاں دسمبر ۱۹۱۴ء میں خود ایک قطعہ تاریخ لکھ کر شائع کیا۔ یہ قطعہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔

تاریخ شبلی

آہ! شبلی بھی ہو گئے رخصت　　دل پر اک اور تازہ داغ ہوا
وہ مئے خوشگوار ہائے کہاں　　آج خالی، بھرا ایاغ ہوا
جس میں کھلتے تھے رنگ رنگ کے پھول　　پائمال خزاں وہ باغ ہوا
ہائے وہ گل فشانیاں اس کی　　جو ملا اس سے باغ باغ ہوا
نہ کمالات پر غرور کیا !　　نہ کسی بات پر دماغ ہوا
کیا کہوں اس کی موت کی تاریخ　　جس کے مرنے کا سب کو داغ ہوا
...... رہا نہ پاؤں رہا　　خانۂ علم بے چراغ ہوا

۱۹ ء ۱۴

(ماہنامہ نقاد آگرہ، دسمبر ۱۹۱۴ء)

ز، خ، ش، نزہت: زاہدہ خاتون شروانیہ نزہت [۱۸۹۴-۱۹۲۱ء] کا ذکر 'شبلی سخنوروں کی نظر میں' میں آچکا ہے۔ وہ نواب سر مزمل اللہ خاں رئیس بھیکم پور کی صاحبزادی تھیں۔ کم عمری میں انتقال کیا۔ ایک مجموعہ 'فردوس تخیل' زندگی میں اور دوسرا بعد از مرگ شائع ہوا۔ وفات شبلی پر انھوں نے بڑی دلدوز حزنیہ نظم کہی، ان کے مجموعہ میں شامل ہے، جسے ناچیز 'شبلی سخنوروں کی نظر میں' شائع کر چکا ہے۔ علاوہ ازیں مرحومہ نے ایک قطعہ تاریخ بعنوان 'کوکب مشرق' بھی کہا ہے جو درج ذیل ہے:

کوکب مشرق

اک آفتاب ہوا آج عازم مغرب
بڑھا کے مرتبہ وشان و منصب مشرق

بھری تھی جس میں شراب مصیبت وکلفت
چھلک پڑا ہے وہ جام ملبب مشرق

وفات حضرت شبلی کی زاہدہ! تاریخ
کہو ''غروب ہوا آہ۔ کوکب مشرق''

۱۹۱۴ء

(فردوس تخیل، ص:۳۵۲)

مولوی سعیدالدین رام پوری: مولوی سعیدالدین رام پوری کے بارہ میں کسی قسم کی معلومات دستیاب نہیں، چونکہ وہ رام پور کے رہنے والے تھے، اس لئے شعرائے رام پور کے تذکرے دیکھے، ان میں ان کا نام بھی نہیں ملا۔ بہرحال انہوں نے بھی ایک فقرہ سے تاریخ نکالی ہے جو یہ ہے:

امام زماں مولوی شبلی طاب ثراہ

۱۳۳۲ھ

(زمیندار لاہور ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء)

مولانا سید سلیمان ندوی: مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) کی شاعری ان کی بلند پایہ نثری کاوشوں میں دب گئی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں زبردست شاعری کی، جس کی داد علامہ اقبال نے بھی دی ہے۔ مجموعہ کلام 'ارمغان سلیمان' شائع ہو چکا ہے۔

علامہ شبلی سے ان کی بے پناہ محبت کے تقاضے نے انہیں بھی استاد کا نوحہ کہنے پر مجبور کیا جو حیات شبلی میں شامل ہے۔ انہوں نے چند قطعات بھی کہے ہیں۔ ان میں ایک لوح مزار بھی شامل ہے:

سعدی عصر و غزالی زمان خلدون وقت

شبلی نعمانی والا گہر عالی سرشت
سیزدہ صد بود وسی و دو در روز پنجمیں
۱۳۳۲ھ چہار شنبہ
بست و ہست ماہ ذی الحجہ کہ ایں منزل بہشت
۲۸: ذی الحجہ

(حیات شبلی ص ۷۶۳)

سفیر: آنجہانی دیا نرائن نگم (۱۸۸۲-۱۹۴۲ء) نے ماہنامہ زمانہ کان پور میں سانحہ وفات شبلی پر وفیاتی نوٹ کے ساتھ علامہ شبلی کی ایک رباعی اور سید محمد حفیظ کا مضمون شائع کیا، لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ''سفیر'' نامی شاعر کا ایک قطعہ تاریخ وفات شبلی بھی شائع کیا۔ یہ شاعر سفیر کون تھے؟ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ قطعہ تاریخ درج ذیل ہے:

قطعہ تاریخ وفات علامہ شبلی نعمانی اعلی اللہ مقامہ

جان پاک اندر ہزاران نوع جسمانی گذشت　　تا بہ ملک جاودان زین منزل فانی گذشت
اول اول صورت ذرات بستہ در جماد　　وز جمادے در گل و ریحاں بستانی گذشت
از چمن بیروں شدہ چوں بوئے گل اندر دماغ　　ہم چو نفس ناطقہ در شکل انسانی گذشت
ہم چناں در ہفت صد ہفتاد قالب شد سفیر　　رفتہ رفتہ در قضائے نور یزدانی گذشت
چیست عمر و مرگ یعنی ارتقائے ایں حیات　　تا روان در پردۂ اسرار پنہانی گذشت
زندہ جاوید ماند ہم چو شبلی مرد کار　　کز میان است گل براوج روحانی گذشت

بعد ازیں دنیائے فانی چوں جہان دیگر است
از جہانے گوئی شبلی نعمانی گذشت
۶۹..۱۹۱۴ء

(ماہنامہ زمانہ کانپور، جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۲۲)

عارؔج: محمد ابراہیم: جلیل قدوائی (۱۹۰۴-۱۹۹۶ء) کے ایک شاگرد محمد ابراہیم عارؔج مدرسہ اردو نمبر-۱، مالے گاؤں کے مدرس تھے۔ اس کے علاوہ کسی قسم کی معلومات دستیاب نہیں ہوسکیں۔

محمد ابراہیم عارج نے علامہ شبلی کی وفات پر کئی قطعات کہے ہیں جو ماہنامہ مخزن لاہور (فروری ۱۹۱۵ء، ص ۷۰-۷۱) میں شائع ہوئے ہیں۔ علامہ شبلی کی وفات پر اگرچہ متعدد قطعات شعرا نے کہے، تاہم کسی نے بھی صنعت زبر و بینات میں قطعہ نہیں کہا۔ یہ شرف صرف محمد ابراہیم عارج ہی کو حاصل ہے۔

قطعات

۱۴

سال وصال جاودانی جناب مولانا شبلی نعمانی مرحوم

۱۹

حیف حضرت شبلی ہوئے دنیا سے جدا آپ کی موت سے عالم کو پریشانی ہے
عارج اب کیوں نہ برآمد ہوں دلوں سے آہیں کہ جگر سوز غم شبلی نعمانی ہے

۱۹ ۱۴ء

دیگر

حامی قوم مسلماں قابل فرد جہاں آہ ! مولانا شبلی زینت ہندوستاں
روز سہ شنبہ بہ بست و ہشتم ذالحجہ را داغ فرقت دادہ ما را رفت در باغ جناں
مصرع سال وصالش عارج غم گیں بنشت عالم آرائے مسلماں آہ رفتہ از جہاں

۱۳۳۲ھ

دیگر در صنعت زبر و بینات

شبلی نعمانی عالی دماغ
کرد رحلت حسرتا وا حسرتا
گفت عارج سن بہ زبر و بینات
رفت شبلی در جناں زیب ہدا

۱۹۱۴ء

مولوی عبدالرحمٰن: زمیندار لاہور ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں ایک اور مادہ تاریخ مولوی عبدالرحمٰن نے درج ذیل فقرہ سے مستنبط کیا ہے:

آفتاب زیر خاک

۱۳۳۲ھ

اس مادہ تاریخ پر علامہ شبلی کے شاگرد مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳-۱۹۵۶ء) نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ

یہ مادہ تاریخ بلحاظ سلاست وسادگی متذکرہ سب جملوں سے اچھا ہے، مگر اس میں لفظ اللہ کے ۳۶ عدد لئے گئے ہیں جو اصول تاریخ نویسی کے مطابق نہیں۔ اللہ کے عموماً ۶۶/ عدد شمار ہوتے ہیں۔

مولوی عبدالرحمٰن کے نام کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

عزیزؔ۔خواجہ عزیز الدین عزیزؔ لکھنوی: علامہ شبلی کی وفات پر ان کے جن احباب شعراء نے تاریخ وفات کہی ان میں خواجہ عزیز الدین عزیزؔ لکھنوی (۱۸۳۷-1915) کا نام بھی شامل ہے، ان میں چند اہم اور منتخب تاریخوں کو مولانا سید سلیمان ندوی نے 'حیات شبلی' میں نقل کیا ہے۔ ان میں خواجہ صاحب کی تاریخ بھی شامل ہے:

آہ! سرِ دفتر ارباب کمال — کہ ز دفتر کدۂ فانی رفت
حاکم محکمہ علم و حکم — ناظم ملک سخن دانی رفت
فاضل و افضل و بے مثل نماند — کامل و اکمل و لاثانی رفت
باکمالے کہ تو آگاہی ازو — ہمہ دانے کہ تو می دانی رفت
ہمتش بیں کہ بیک پائے آخر — تا بہ منزل گہِ روحانی رفت
راہ داں آمد و ہم راہِ شناس — رہِ دشوار بہ آسانی رفت
بر دل و جانِ من از رفتن اُو — رنج روحانی و جسمانی رفت

خاست چوں از سر جان ہاتف گفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

اس قطعہ تاریخ میں علامہ شبلی کے علمی وادبی کمالات کو جس خوبی سے بیان کیا گیا ہے وہ معاصرانہ اعترافات عظمت کا ایک بہتر نمونہ ہے۔

عزیز لکھنوی: علامہ شبلی کے ایک دوست مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی (۱۸۸۲-۱۹۳۵ء) نے بھی ایک قطعہ تاریخ کہا ہے، جو ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہے، جو راقم کو اس وقت دستیاب نہیں ہوسکا تھا جب

"شبلی سخنوروں کی نظر میں" زیر تالیف تھی، حالانکہ یہ ایک اہم اور قابل ذکر قطعہ تاریخ ہے:

قطعہ تاریخ وفات مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ

آہ! سر دفتر ارباب کمال — کہ ز دفتر کدۂ فانی رفت
حاکم محکمہ علم حکم — ناظم ملک سخندانی رفت
فاضل وافضل و بے مثل نماند — کامل و اکمل ولاثانی رفت
باکمالے کہ تو آگاہی ازو — ہمہ دانے کہ تو میدانی رفت
ہمتش بین کہ بیک پائے آخر — تا بہ منزل گہ روحانی رفت
راہ داں آمد وہم راہ شناس — رہ دشوار بآسانی رفت
بردل وجان ازرفتن او — رنج روحانی وجسمانی رفت

خاست چوں از سرجان ہاتف گفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

۱۳۳۲ھ

(کلیات عزیز، ص ۳۰۲، مطبع نامی لکھنو، ۱۹۳۱ء)

اس موقع پر انہوں نے ایک مسدس بھی کہا۔

مسدس بروفات مولانا شبلی نعمانی

اے دل افسانہ پر درد بگو — زان جوان مرد جہاں گرد بگو
کہ سوئے خلد سفر کرد بگو — برہ ورسم بر آورد بگو

ازسخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

دشمن اہل خرد دوراں شد — خالی ازعلم وعمل گنہ یاں شد
از ادب وزطلبش حرماں شد — ملک معنی وبیان ویراں شد

ازسخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

خلقے از چرخ کہن می نالد خلقے از رنج و محن می نالد
ہر یک ازاں سخن می نالد درچمن مرغ بہ چمن می نالد
ازسخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

دست جور فلک کور سواء دفتر دولت دیں داد بیاد
یک قلم علم وعمل رفت زیاد قلم از کف علم از ہا افتاد
ازسخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

۱۳۳۵-۳=۱۳۳۲ھ

(کلیات عزیز،ص۱۰۳،مطبع نامی لکھنو،۱۹۳۱ء)

عزیز لکھنوی نے 'غروب الشمسین' کے نام سے علامہ شبلی وحالی کا مشترکہ مرثیہ بھی لکھا ہے جوان کے بعدازمرگ مطبوعہ مجموعہ کلام 'اوراق عزیز' (ص۳۵-۳۸) میں شامل ہے،راقم نے اسے بیان شبلی حصہ سوم میں شائع کردیا ہے۔

مولانا سید علی زینبی: مولانا سید علی زینبی (م: یکم ستمبر ۱۹۴۸ء) سابق استاد ادب دارالعلوم ندوہ لکھنو، بڑے عالم وفاضل،شعروادب اورریاضی وغیرہ علوم وفنون میں جیدالاستعداد تھے۔مضامین عربی میں لکھا کرتے تھے۔ابن قدامہ کی مشہور کتاب نقدالشعر کے حواشی اوراسلامی جنتری ان کی یادگاریں ہیں۔

سانحہ وفات شبلی پر زمیندارلاہور میں قطعات تاریخ کی اشاعت سے انہوں نے دلچسپی لی، اولاً علامہ اقبال کے لوح مزار کے نامکمل ہونے کی نشاندہی کی،پھر۲۱؍دسمبر۱۹۱۴ء کے زمیندار میں فارسی زبان میں ایک طویل قطعہ تاریخ وفات شبلی شائع کرایا۔جودرج ذیل ہے:

دوش رفتیم سوئے دارعلوم ندوہ کہ ہمان است بجا کعبہ روحانی ما
ماند اینم چہ چیز است کہ مارا بکشید جذبہ داشت مگر سوزش پنہانی ما
حسرت آلود بہر سمت نظر ہا کردیم درو دیوار جزو او ز بے جانی ما
اندریں کلبہ احزاں چہ تو آں گفت زبود ہر درے نوحہ گر بے سرو سامانی ما

بعد ازاں ز جلہ دیدیم بخاک افتادہ ہمہ مصروف بزاری و عزا خانی ما
ایں گروہ طلبہ بود کہ نوحہ می کرد بر زبوں بختی خود و در پریشانی ما
گفتم اے دوش نشینان ملائک چہ بود؟ ہمہ گفتند فتاد افسر شاہانی ما
خواستم صاف بگویند جوابم آمد
کہ بگو رفت ز ما شبلی نعمانی ما

۱۳۳۲ھ

علامہ شبلی کا لوح مزار

علامہ اقبال کے لوح مزار کی تصحیح کے لئے مولانا نازبیی نے مدیر زمیندار کو خط لکھا تھا اس میں ایک لوح مزار بھی لکھ بھیجا تھا۔دونوں درج ذیل ہیں:

عنوان بالا سے ۳؍دسمبر (۱۹۱۴ء) کے زمیندار میں جناب ڈاکٹر محمد اقبال پی ایچ ڈی نے علامہ (شبلی) مرحوم کی لوح مزار کے لئے جو تاریخ تحریر فرمائی ہے اس میں ایک عدد کی کمی رہ گئی ہے،اس لئے ذیل کا فقرۂ تاریخی زیادہ موزوں ہوگا۔

امام الانام شبلی اطاب اللہ ثراہ

۱۳۳۲ھ

(زمیندار، لاہور، ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء، نمبر ۲۴۶)

قیم: مولوی محمد ابراہیم: مولوی محمد ابراہیم متخلص بہ قیم، لائل پور کا ایک فارسی قطعہ تاریخ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۵؍جنوری ۱۹۱۵ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے اور بہت متاثر کرتا ہے۔مولوی محمد ابراہیم قیم کے حالات باوجود تلاش بسیار کے معلوم نہ ہوسکے۔قطعہ تاریخ درج ذیل ہے:

قطعه تاریخ

انتقال سراسر ملال، جناب مولوی شبلی نعمانی طاب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ

از نتیجۂ طبع

[علامہ حمیم جناب مولانا مولوی محمد ابراہیم متخلص با قیم ساکن لائل پور]

دریغا حسرتا زین دار و بنائے دنیائے فانی باستسفار رواں شد مولوی شبلی نعمانی

امیر الواعظین حافظ بتر تیپائے قرآنی علیم و صوفی و شاعر، مسلم درسخن دانی
مصنف در علوم عقلی و نقلی چو ہمہ دانی مثلش کس ندیدہ درجہان بکر خوشخوانی
زفکر سالِ وصلش چوں شدم غروب حیرانی نگوش ہوش من آمدندا راز مطلب حمانی
زنار بخش شومی آگاہ انتہا گیر ہمیں خوانی بہ جنت جائے دارد مولوی شبلی نعمانی

۱۳۳۳ھ

اس قطعہ پر قطعہ نگار نے یہ نوٹ لکھا ہے: خوش خوانی میں یائے مصدر یہ ہے، اس لئے تکرار قافیہ نہ متصور ہوگا۔

راقم عبدالغنی ۔از شفاخانہ سلیمی لاہور

(روزانہ پیسہ اخبار، لاہور، ۱۵/جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۱)

حکیم لطیف احمد: حکیم لطیف احمد ابن مولوی سعید، موضع بہادر پور (نزد سیوان بہار) میں پیدا ہوئے، آبائی وطن احمد آباد تھا، بڑے عالم فاضل تھے، عربی و فارسی میں دسترس رکھتے تھے، فقہ اور علم نجوم میں بھی درک تھا۔ ۸/رمضان ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۳/نومبر ۱۹۳۷ء کو تھلی (سارن، بہار) میں وفات پائی اور تھلی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نعمانی کی وفات حسرت آیات پر حکیم لطیف احمد کے قطعات تاریخ اور لوح مزار ماہنامہ 'تہذیب نسواں' لاہور ۲۳/جنوری ۱۹۱۵ء کے شمارہ میں شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے اپنی کتاب "حکیم لطیف احمد اوران کی تاریخ گوئی" میں بھی ان کو شامل کیا ہے ۔ یہ قطعات اور لوح مزار "شبلی سخنوروں کی نظر میں" شامل نہیں ہیں۔

قطعات تاریخ وفات علامہ شبلی

(۱)

کیوں نہ یوں چھائے رنج وغم کی گھٹا کیوں نہ برپا ہو ماتم و کہرام
کیوں نہ یوں روئیں اشک خوں آنکھیں نیند آنکھوں میں یوں نہ کیوں ہو حرام
کہ وہ علامہ زماں ہمہ داں فاضل افضل و شہیر انام
قوم کی جاں وروح حب وطن مشعل دیں و کوکب اسلام

منطقی فلسفی لبیب ادیب مجتہد اہل فقہ سب کے امام
عید قرباں کی بست وہشتم کو ناگہاں پاکے موت کا پیغام
چل بسے اس جہان فانی سے سوئے ملک عدم برائے دوام
وقت پر آخر آکے رہتی ہے ہے قضا کی کوئی روک نہ تھام
صاف تاثیر نے جواب دیا کچھ دعا یا دوا نہ آئی کام
شدنی تھی جو کچھ وہ ہو کے رہی کہئے اب کس کو دے کوئی الزام
زیر چرخ بریں بروئے زمیں ڈھونڈ ڈالا بقدر وسع تمام
اب نہیں کوئی جانشین ان کا ہے اگر تو فقط انہیں کا نام
حق ہے ان کا یہ اے مسلمانوں! کہ پڑھیں ان پر اب درود وسلام
دم اظہار نام پاک ہوا قلم دل فگار کو الہام
لکھ دے فصلی میں مصرعہ تاریخ مولوی شبلی بہشت مقام
۱۳۳۲ف

ازلطیف احمد
تتھلی، سارن

(حکیم لطیف احمد اوران کی تاریخ گوئی، ص۵۰)

(۲)

بہ روز محاق مہ عید قرباں
گئے مولوی شبلی پاک طینت
کہی اس کی ہاتف نے تاریخ فصلی
ہوئی ان کے قدموں سے جنت کو زینت
۱۳۲۲فصلی

(حکیم لطیف احمد اوران کی تاریخ گوئی، ص۵۱)

(۳)

نومبر میں شبلی نے مر کر لیا
جو فردوس میں خوش نما قصر تھا
یہ ہے مصرعہ لاجواب اس کا سال
یہ شبلی نہ تھا شبلی عصر تھا

۱۹۱۴ء

ان قطعات کے علاوہ حکیم لطیف احمد نے دو لوح مزار بھی کہے ہیں جو ماہنامہ تہذیب نسواں لاہور ڈاکٹر مظاہر الحق کی کتاب میں بھی شائع ہوئے ہیں:

لوح مزار

مر چکے قبر ہو چکی تیار
ہے یہ ذی الحجہ کا آخری منگل
یہ ہے اک یادگار تاریخی
مدفن شبلی بہشت محل

۱۳۳۲ھ

(ماہنامہ 'تہذیب نسواں' لاہور، ۱۶/ جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۳۵-۳۶)

(۴)

چو بگذشت ذی حجہ رابست وہشت
بہ جاں آفرین کرد تفویض جاں
بفرمودہ تاریخ سالش لطیفؔ
کہ شد شبلی سوئے جناں

۱۳۳۲ھ

(ماہنامہ 'تہذیب نسواں' لاہور، ۱۶/ جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۳۵-۳۶)

(حکیم لطیف احمد اور ان کی تاریخ گوئی، ص ۷۱-۷۲)

مسعوؔد: سید مسعود حسن: خان بہادر سید مسعود حسن مسعوؔد (بی،سی،ایس) ۱۸۸۵ء میں اتر پردیش کے ضلع کھیری لکھیم پور میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی پاس تھے۔ لکھیم پور کھیری کے ڈپٹی کلکٹر رہے۔ انہیں ابتدائے عمر سے شعر و شاعری سے شغف اور جذباتی لگاؤ تھا۔ استاذ شاعر افضل علی خاں افضؔل پسر منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی سے اصلاح سخن لی، تاحیات دادِ سخن دیتے رہے۔ ان کے چار مجموعہ کلام طغرائے سخن، باغ دلکش، باغ نسریں اور عندلیب تواریخ (الہ آباد ۱۹۶۳ء) شائع ہوئے۔

سید مسعود حسن کو تاریخ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ آخر الذکر مجموعہ کلام عندلیب تواریخ دراصل مادہ ہائے تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی بھی تاریخ وفات، اردو و فارسی دونوں میں صنعت صوری میں نکالی ہے۔

تاریخ وفات

شمس العلماء حضرت مولانا شبلی نعمانی

درصنعت صوری

(۱)

جناب مولوی سبحان رفعت تھے علم و فضل کی بیدار دولت

تھے اعظم گڑھ میں وہ اک رکنِ اعظم جہاں میں حامل صد فخر و عزت

عظیم المرتبت نعمانی شبلی

ہوئے انیس سو چودہ میں رخصت

۱۹۱۴ء

(۲)

علامہ عصر ایں صدی رفت ز دہر شعرش اعلیٰ بدہ عبارت شستہ

مسعود سن وفات پرسید زفکر دانائے زماں حضرت شبلی گفتہ

۱۹۱۴ء

ناطق کلانوری: منشی عاشق علی خاں ناطق کلانوری کے بارہ میں معلومات دستیاب نہیں ہیں، مگر ان کا نتیجہ فکر علامہ شبلی کے لوح مزار کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ زمیندار لاہور ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء کے

شمارہ میں درج ہوا ہے:

مولانا شبلی نعمانی نوراللہ مرقدہ

۱۳۳۲ھ

نثاؔر: میر نثار حسین : میر نثار حسین نثاؔر فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔۱۹۱۴ء میں علی گڑھ میں محکمہ آب پاشی (نہر) میں مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز تھے۔اس کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اٹھائیسویں سالانہ اجلاس راولپنڈی ۱۹۱۴ء میں میر نثار حسین شریک ہوئے تھے، چونکہ چندماہ پہلے ہی علامہ شبلی نعمانی کا سانحہ وفات پیش آیا تھا اور وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اہم رکن بھی تھے اس لئے نظم ونثر میں شرکائے اجلاس نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا، اس موقع پر میر نثار حسین نثاؔر نے فارسی میں بارہ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ تاریخ پیش کیا، جو درج ذیل ہے۔

قطعہ تاریخ وفات

شبلی کہ بود منبع افضال وکان علم
شبلی کہ بود صاحب اوصاف بے کراں

شبلی کہ بود شمع شبستان علم وفضل
شبلی کہ بود عاقل وفرزانہ بے گماں

شبلی کہ بود بلبل باغ سخن وری
شبلی کہ بود زینت بزم سخن وراں

شبلی کہ بود بلبل بستان مصطفیٰ
بُد فخر علم وفضل وادب رابہ ذات آں

آں مجمع الصفات چو خوابید زیر خاک
شد آفتاب علم وہنر درزمیں نہاں

برباد گشت گلشن فضل وکمال آہ
چوں مرگ روح او بہ جناں کرد آشیاں

آں فاضل اجل چوں خرامیدہ سوئے خلد
ہر سو بپا ز درد شدہ نالہ فغاں

یکتائے روزگار وحید زماں گذشت
می کرد قوم ناز برآں فاضل جہاں

تالیف سیرۃ نبوی ناتمام ماند
شد پارہ پارہ دفتر امید ناگہاں

مثلش نزاد مادر گیتی کسے دگر
مانند او نیافت مگر دور آسماں

زیں واعہ کہ بر دل من تیر غم نشست
زیں حادثہ کہ دیدہ من کرد خوں رواں

گفتہ نثار خستہ جگر سال رحلتش
بگذشت وائے شبلی علامہ زماں

(ماہنامہ کانفرنس گزٹ علی گڑھ، جنوری ۲۰۰۵ء۔ ماہنامہ علی گڑھ منتھلی، نومبر ۱۹۱۴ء، ص ۱۸۴-۱۸۵)

اس قطعہ کے بارہ میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی مرحوم کا خیال ہے کہ یہ اس سلسلے کی تمام منظومات میں شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ (معارف اعظم گڑھ، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۳۴۵)

نظرؔ: سید احمد مرتضیٰ: سید احمد مرتضیٰ نظر (۱۸۷۸ - ۱۹۴۲ء) اپنے عہد کے ممتاز شاعر و ادیب اور مصنف و مورخ تھے۔ 'آثار مالوہ' اور 'تاریخ صولت شیر شاہی' ان کی تاریخی تصنیفات ہیں۔ علامہ شبلی کی وفات پر انھوں نے بھی فارسی میں ایک قطعہ تاریخ کہا ہے، جسے مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں نقل کیا ہے:

چو علامہ شبلی پاک باطن　　بحکم الٰہی ز دار فنا رفت
نظر ہاتف غیب سال وفاتش　　بگفتا کہ ''شبلی بہ دار بقا رفت''

۱۳۳۲ھ

نظرؔ مرحوم کے مجموعہ کلام ''تجلیات نظر'' میں مذکورہ قطعہ تاریخ کے علاوہ لوح مزار کے لئے دو مصرعے بھی شامل ہیں۔

لوح مزار

۱۔ مزار شہید علم نبی شبلی نعمانی

۱۳۳۲ھ

۲۔ مولانا شبلی جنت نشیں

۱۳۳۲ھ

دوسرا قطعہ تاریخ نو اشعار پر مشتمل ہے:

گنج معقول ، محمد شبلی　　بحر منقول ، محمد شبلی
روز شب در سیر و در تاریخ　　بود مشغول ، محمد شبلی
شہرہ شبلی نعمانی شد　　سیف مسلول ، محمد شبلی
گردن معترضان را بدلیل　　کرد مغلول ، محمد شبلی
بہر ایصال معانی بہ جہاں　　بود مجبول ، محمد شبلی
چشم آفاق بکحل جوہر　　کرد مکحول ، محمد شبلی

آخر از دار فنا کرد سفر سوئے ماموں ، محمد شبلی
الفت سیرت نبوی بردش شدہ موصول ، محمد شبلی
گفت ہاتف بنظر تاریخش گشت مقبول ، محمد شبلی

۱۳۳۲ھ

پروفیسر سید نواب علی: پروفیسر سید نواب علی (۱۸۷۷-۱۹۶۱ء) سابق وزیر تعلیم ریاست جونا گڑھ، معلم، صاحب قلم اور مصنف ومولف، سیرت نگار اور اردو و فارسی کے شاعر تھے۔ علامہ شبلی کے بڑے معتقد تھے۔ کیننگ کالج لکھنو کے زمانہ طالب علمی میں علامہ شبلی کی مجلسوں کے حاضر باشوں میں تھے۔ وفات شبلی پر انھوں نے ایک پر اثر ماتمی نظم کہی جو نا چیز کی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' شامل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک قطعہ تاریخ اور بھی کہا ہے، جو زمیندار لاہور یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

شد چو از دنیائے دوں سوئے جہاں
شبلی آں علامہ عالی ہمم
کلک نواب از پئے تاریخ فوت
''ابن رشد الہند رفتہ'' زور قلم

۱۳۳۲ھ

اس قطعہ سے نواب صاحب کے دل میں جو عظمت شبلی تھی اس کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

•••

شبلیؔ کی نظمیہ شاعری کا احتجاجی رویہ

ڈاکٹر محمد شارق
شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
nomani31@gmail.com

۱۸۵۷ء کا زمانہ ایک ایسے کشمکش کا دور تھا جب مشرقی تہذیب زوال پذیر تھی اور مغربی تہذیب ہندوستانیوں کے تمام مظاہر حیات پر اپنا تسلط جما رہی تھی۔ مغربی تہذیب کے تسلط کے پس پردہ استعماری حربہ کارفرما تھا جو مشرق کے اقدار کو اپنی سائنسی ایجادات اور صنعتی انقلاب سے متزلزل کر رہا تھا، اس عہد میں برصغیر کے علماء دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، ایک کی رہبری سر سید کر رہے تھے جو مغربی تہذیب اختیار کرنے میں مشرق کی نجات تصور کر رہے تھے، دوسرا طبقہ ان دانشوروں کا تھا جو مشرق اور مغرب کے امتزاج کے قائل تھے جس کی نمائندگی کا فریضہ شبلی انجام دے رہے تھے وہ جو اس عہد کی کشمکش میں مشرقی تہذیب اور اقدار کی بازیافت کے خواہاں تھے، شبلی کی یہ کوشش مغرب کی اس ہمہ گیر استعماری حربے کے سامنے احتجاج اور مزاحمت سے تعبیر کی جا سکتی ہے جو پورے مشرق کو اپنے رنگ میں رنگنے کے درپے تھی۔ شبلی کی علمی و ادبی کاوشوں کا اگر مغربی تہذیب کے مدمقابل احتجاج اور مزاحمت کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو شبلی کے علمی اکتسابات پر نظر کرنے کا ایک نیا زاویہ مل جاتا ہے۔

شبلی کی سیرت النبیؐ یا المامون، الفاروق، علم الکلام، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر وغیرہ وہ تصانیف ہیں جن کے ذریعے مغربی تہذیب کے سامنے مشرق کے حکومتی نظام، عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، ان کی تعلیمی صورتحال اور مشرق میں نظام تعلیم کا اثبات مقصود ہے جو احتجاجی فکر کا ہی زائیدہ معلوم ہوتا ہے۔ شبلی کی شخصیت ایک سیرت نگار، تاریخ داں اور ایک ادبی مورخ کے طور پر مسلم ہے۔ ان

کے علمی اکتسابات کا ایک پہلو ان کی شاعری بھی ہے۔ ان کی کلیات نظم، مثنوی، مسدس، قصیدہ، غزل، مرثیہ ہر صنف سے آباد ہے۔ سر دست ان کی نظمیہ شاعری کا احتجاجی پہلو موضوع بحث ہے، ان کی نظمیہ شاعری عصری مسائل پر ردعمل سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی مسائل پر اپنے موقف کے اظہار کے لیے نظم کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ان نظموں سے ان کی دانشوری اور سیاسی بصیرت کا اظہار بحسن خوبی ہوتا ہے۔ ممتاز شبلی شناس ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی شبلی کی سیاسی نظموں کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

کلیات شبلی میں شبلی کی سیاسی نظمیں نہایت ہی اہم ہیں وہ نہ صرف ان کا بلکہ شعر و ادب اور تاریخ و سیاست کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ عالم اسلام کے سیاسی حالات مسلمانوں کی پستی و زبوں حالی اور ذلت و رسوائی پر شبلی جس طرح تڑپے اور بے قرار ہوئے ہیں شعرا کے یہاں اس کی مثال شاید ہی ملے اصلاً ان کے یہی خونی آنسو نظم کے پیکر میں ڈھلے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تاثیر اور اثر انگیزی کے لحاظ سے ان کی نظموں کا اردو ادب میں جواب نہیں[۱]۔

۱۸۵۷ء میں زمانے نے ایسی کروٹ بدلی کہ ہر طرف افراتفری اور ہنگامی حالات پیدا ہو گئے، حادثات و واقعات نے لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس اور دہشت کا ماحول پیدا کر دیا، ایسے میں جن ادیبوں نے ان مسائل پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا ان میں سے ایک اہم نام شبلی کا ہے، جنھوں نے خود کو شدت جذبات سے مبرا رکھا ۔شبلی کی احتجاجی شاعری میں نشتریت نہیں بلکہ توازن پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی سیاسی نظمیں شاہکار بن جاتی ہیں۔ ڈاکٹر شباب الدین لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نوع کی نظمیں جن مسائل کے گرد گھومتی ہیں ان سب کو لمحاتی مسائل کہا جا سکتا ہے مگر شبلی کی شاعرانہ صناعی کا کارنامہ یہ ہے کہ ان مسائل کو ختم ہوئے تقریباً پون صدی گزر چکی ہے مگر ان کے اشعار کی معنویت، جاذبیت اور کاٹ آج بھی زندہ ہے وہ خواہ جنگ بلقان پر اظہار خیال کریں خواہ مسلم یونیورسٹی کے مسائل ہوں مسلم لیگ کے حالات بیان کریں خواہ کانپور کی مسجد کی شہادت پر اپنے جذبات کا اظہار کریں ان کے اشعار کی آبداری آج تک ماند نہیں ہونے پائی۔

۱۔ آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء، ص، ۴۹۸

دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ موضوعات ہیجانی اور لمحاتی ضرور تھے مگر شبلی نے ان کو جس فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے اسی انداز کی وجہ سے وہ ایسے ادب پاروں میں ڈھل گئے ہیں جن کی معنویت آج بھی برقرار ہے[۲]۔

شبلی کا یہ انداز شبلی سے شروع ہو کر شبلی پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کسی بھی جذباتی کیفیت کو توازن کے ساتھ بیان کرنا اور اس میں پر خلوص لہجہ کو برتنا نہایت مشکل امر ہے یہ شبلی کا ہی طرۂ امتیاز ہے کہ وہ کسی بھی نوعیت کے احتجاج کو اپنی لے میں ادبی چاشنی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ وزیر آغا لکھتے ہیں:

شبلی نعمانی کی سیاسی نظموں کا مطالعہ کریں تو ہم سب سے پہلے یہی تاثر قبول کرتے ہیں کہ یہ نظمیں سوز وگداز کے عناصر سے متصف ہیں دراں حالانکہ حقیقت محض یہ ہے کہ شاعر نے ہنگامی واقعات سے متاثر ہو کر یہ نظمیں سپرد قلم کیں اور ان کا محرک کسی شخصی نقصان کا احساس نہیں تھا۔ یہ بات اس چیز پر دال ہے کہ شبلی مرحوم کے لیے قومی یا ملکی معاملات بھی واردات قلب کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے اجتماعی صورت کے باوصف وہ ان سے اس طرح متاثر ہوتے تھے جیسے اپنے ذاتی معاملات سے، چنانچہ شبلی کی سیاسی نظموں کا طرۂ امتیاز ان کا وہ پر خلوص لہجہ ہے جو ناظر کو فی الفور متاثر کرتا ہے اس سب پر مستزاد ان کی نظموں میں وہ سوز اور تڑپ بھی ہے جو وقت گزر جانے کے باوجود دل کے تاروں کو مرتعش کر سکتی ہے۔ شبلی کی سیاسی نظموں کی یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ ان نظموں کی سرحدیں ادب کی سرحدوں میں ضم ہو جاتی ہیں اور اس انضمام کے نتیجے میں ایک ایسی شاعری وجود میں آئی جس کے موجد بھی شبلی نعمانی ہیں اور غالباً یہ انہی پر ختم ہو گئی ہے[۳]۔

شبلی نعمانی شاعری کے ذریعہ سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تاریخ کی سچائیاں اور حقیقت بیانی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے مبالغہ آرائی اور خیال آرائی سے گریز کیا، واقعیت کے ساتھ شعریت اور اثر انگریزی پیدا کی۔ جیسے وہ سرسید مشن سے جب وابستہ ہوئے تو قومی یکجہتی اور ترقی کے لیے نہایت خوبصورت پیرائے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا مثنوی

۲- دارالمصنّفین کی ادبی خدمات کا تعارف (۱۹۸۰ تک)، ڈاکٹر شباب الدین، ۲۰۰۸ء، ص ۸۲

۳ - فکرونظر، شبلی نمبر، شہریار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جون ۱۹۶۹ء، ص ۳۸

''صبح امید'' جو سرسید کی فرمائش پر لکھی وہ قومی جذبے سے مملو ہے۔ اس مثنوی کے ذریعہ شبلی نے پہلی بار حسن و عشق کی فرسودہ روایات سے انحراف کیا اور قومی عروج و زوال کی تاریخ پیش کی، مستقبل کو سنوارنے کے لیے جہد مسلسل کی تلقین کی، سرسید تحریک کی راہ ہموار کرنے کا مشورہ دیا اور ان مخالفین علماء سے انحراف کیا جو قوم کے لیے کچھ نہیں کرتے تھے اور سرسید پر مسلسل طنز و تعریض کرتے رہتے تھے۔ مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سید سے اگر ہے بغض للہ — وہ خادم قوم اگر ہے گمراہ
کچھ آپ ہی انتظام کرتے — اسلام کو نیک نام کرتے
باتیں نہ فقط بنا کے رہتے — جو منہ سے کہا دکھا کے رہتے
اسلام کی دوستی تو یہ تھی — الفت کی دلیل تھی تو یہ تھی
یہ وقت جو آپڑا ہے مشکل — ہے پردہ کشائے حق و باطل[۴]

مذکورہ اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ شبلی قوم کی ترقی کے لیے ہر طرح سے نبرد آزما تھے وہ اسلام دوستی اور حق و باطل کے درمیان فرق کی پردہ کشائی کرنا چاہتے تھے اور شعوری طور پر قومی روح کو بیدار کرنے کے خواہاں تھے حتی کہ سرسید کے بعض معترضین سے اعتراض کے بجائے عمل کے جوہر دکھانے کی اپیل کرتے ہیں۔ اس طرح شبلی نے جہاں شخصی یا عمومی طور پر ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ ان کے دلی جذبات کی بہترین عکاسی ہے۔ چونکہ شبلی کے معیار احتجاج کا جوہر ان کی سیاسی نظموں میں نمایاں ہوتا ہے اس لیے ان کے احتجاجی رنگ سے واقف ہونے کے لیے ان کی نظم ''شہر آشوب اسلام'' جو ہنگامہ طرابلس و بلقان سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک — چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے — فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سب ہے رقص بسمل کا تماشہ دیکھنے والے — یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک

۴۔ کلیات شبلی اردو، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
زوال دولتِ عثماں، زوال شرع وملت ہے عزیزو! فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟ نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک
جوہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں کہ اب امن وامان شام ونجد وقیرواں کب تک [۵]

شبلی نے اس نظم میں مشرقی تہذیب اور اقدار کے زوال کا نوحہ بیان کیا ہے شہر آشوب اسلام میں کب تک، کب تک کی ردیف استعمال کر کے جو سوالیہ نشان قائم کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم مسلم سے فریاد کناں ہیں کہ اے لوگو کب تک اپنی مظلومیت اور بربادیوں کا نوحہ کرتے رہو گے کیا تم اتنے زوال آمادہ ہو گئے ہو کہ تمہارے اندر احتجاج ومزاحمت کا جذبہ بھی نہیں رہا، کیا ایک ایک کر کے تمام مملکت اسلامی کو ان فرنگیوں کے حوالے کر دو گے جنہیں غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی گریہ وزاری اور آلام سرشار کرتے ہیں۔ پھر ان انگریزوں سے مخاطب ہوتے ہیں جو خود کو انسانی تہذیب کا پروردہ کہتے ہیں، ہر طرف ظلم وزیادتی اور حشر برپا کیے ہوئے ہیں، اس کے بعد مزید انتقام فتح ایوبی کی طرف اشارہ کر کے ایک طرف قوم کو اپنے تابناک ماضی کی یاد دلاتے ہیں تو دوسری طرف انگریزوں کو بھی صلیبی جنگ کی یاد بڑے لطیف انداز میں دلاتے ہیں اخیر میں نہایت خوبصورت انداز سے یہ واضح کرتے ہیں کہ اگر اب بھی تم نے مزاحمت نہیں کی تو مذہب اسلام کی لوہے جیسی فصیل کو کیسے محفوظ رکھ سکو گے۔ اسی طرح نظم ''خیر مقدم ڈاکٹر انصاری'' میں مزاحمت کا نہایت خوبصورت اظہار کیا ہے نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری
ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی یہی تھا درد اسلامی یہی تھی رسم غم خواری
فراق ملک و ترک خانماں و دوری منزل خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لی ساری

۵ - کلیات شبلی، اردو، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۶۵۔۶۶

تمہارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے
صدائے نالہائے درد و جوش گریہ و زاری

جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہل وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری

کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کے لیے وہ آپ کی شب ہائے بیداری

جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمہیں دعوائے آقائی
کہ تم نے کی ہے ترکان مجاہد کی پرستاری

تمہارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیان دین کی کی ہے ناز برداری

تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہر باری

تمہیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرز خونخواری

نہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی[۶]

ہندوستانی طبی وفد جو جنگ بلقان میں ترکی بھیجا گیا تھا ان کی آمد پر جس طرح نظم ''خیر مقدم ڈاکٹر انصاری'' میں اپنے وفد کو خوش آمدید کیا ہے اور جن کلمات سے ان کی پذیرائی کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگ فتح کر کے آئے ہیں اور ملت ان کی جتنی بھی ناز برداری کرے کم ہے۔ایک اور نظم ''اسلام کے تنزلی کا اصلی سبب'' میں جو نقشہ شبلی نے مسلمانوں کا کھینچا ہے۔اس میں کسی خاص علاقے کی طرف اشارہ نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کی عالمی سطح پر خستہ حالی کو نمایاں کیا ہے اور ذلت و خواری سے تعبیر کیا ہے۔نیز واضح کیا ہے کہ جو لوگ مغربی تعلیم حاصل کر کے واپس آئے ہیں انہیں دانشوروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاتا۔مزید یہ کہتے ہیں کہ انہیں توحید پر یقین نہیں اخوت اور بھائی چارگی اسلام اور انسانیت کا ایک اہم فریضہ ہے وہ بھی ان کے یہاں ناپید ہے۔غرض ان کے یہاں قرآن وسنت کے مطابق افعال نہیں۔یہ وہ اسباب ہیں جس کی وجہ سے قوم ذلیل و پسپا ہو رہی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات ہے اب امر صریح
کہ زمانے میں کہیں عزت اسلام نہیں

آپ جائیں گے جہاں قوم کو پائیں گے ذلیل
اس میں تخصیص عراق و عرب و شام نہیں

اس نے یورپ کے مدارس میں جو سیکھے ہیں علوم
وہ ابھی ابجد تعلیم سے بھی رام نہیں

اس قدر فرق و تفاوت پہ بھی ہے عام یہ بات
قوم کا دفتر عزت میں کہیں نام نہیں

پس اگر غور سے دیکھو تو بجز مذہب و دیں
ہم مسلمانوں میں کوئی صفت عام نہیں

۶ - کلیات شبلی، اردو، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۶۷

ان اصولوں کی بنا پر یہ نتیجہ ہے صریح سبب پستی اسلام جز اسلام نہیں
الغرض عام ہے وہ چیز جو بے دینی ہے صاف یہ بات ہے دھوکہ نہیں ابہام نہیں
ان حقائق کی بنا پر سبب پستی قوم ترک پابندی اسلام ہے اسلام نہیں [۷]

شبلی کے ایک بہت ہی مقبول اور مشہور نظم ''ہم کشتگان معرکہٗ کانپور ہیں'' جو ۱۹۱۲ء میں اس حادثے کے بعد منظر عام پر آئی جب کانپور کے محلّہ مچھلی بازار میں ایک مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسجد سرراہ تھی اور جہاں ایک نئی سڑک نکل رہی تھی جس میں وضوخانہ کا حصہ سڑک کے بیچ آ گیا تھا اور بغیر مسلمانوں کی اجازت اور مرضی کے اس کو حکومت کے اشارے پر شہید کر دیا گیا اس واقعہ نے تمام مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ اس موقع پر ایک جلسے کا انعقاد ہوا جس میں بوڑھے جوان بچے سبھی موجود تھے اور وہ سبھی لوگ پورے جوش وولولے کے ساتھ منہدم دیواروں کی تعمیر نو کرنے لگے۔ یہ خبر جب حکمران وقت تک پہنچی تو انہوں نے غیر مسلح افراد پر فوج سے گولیاں چلوا دی جس کے نتیجے میں پورے ملک میں مسلمانوں کے اندر غم وغصہ شدید ہو گیا بعد میں فرنگیوں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت ہو گئی اور یہ طے پایا کہ اوپر مسجد کی چھت ہو گی اور نیچے سے سڑک جائے گی لیکن اس سانحہ نے شبلی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا جس کے نتیجے میں ''ہم کشتگان معرکہٗ کانپور ہیں'' نظم منظر عام پر آئی۔ نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر نیند آگئی ہے منتظر نفخ صور میں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا جو خاک وخوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا ہم کشتگان معرکہٗ کانپور ہیں [۸]

۷۔ کلیات شبلی، اردو، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۵۹۔۶۰

۸۔ کلیات شبلی، اردو، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۸۴

علامہ شبلی کی سیاسی نظموں کی اہمیت اور اردو شاعری میں ان کی اولیت ایسا موضوع ہے جس پر تفصیل سے گفتگو بھی ناکافی محسوس ہوگی۔ تاہم رسالہ فکر ونظر علی گڑھ کے شبلی نمبر میں پروفیسر آل احمد سرور نے ''شبلی کی اردو شاعری'' کے عنوان سے جو بحث کی ہے اس کی روشنی میں شبلی کی شاعری خصوصاً ان کی سیاسی شاعری کی کئی جہتیں سامنے آجاتی ہیں۔ آل احمد سرور نے عدل جہانگیری کا ایک شعر نقل کیا کہ:

اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

اور لکھا کہ اردو میں اس معجز بیانی کی کوئی اور مثال اس وقت ہمارے ذہن میں نہیں۔ انہوں نے لکھا کہ وہ اشعار جو شاعری کی انتہائی بلندیوں پر ہوتے ہیں وہ محض آمد کا نتیجہ نہیں بلکہ اکثر ان کے معجزۂ فن میں بھی شاعر کا اتنا ہی خون جگر صرف ہوتا ہے۔ آل احمد سرور نے سیاسی نظموں میں 'شہر آشوب اسلام' اور 'خیر مقدم ڈاکٹر انصاری' کی جانب خاص توجہ کی اور کہا کہ یہ سوال نہیں ہے کہ شبلی کا درد وکرب کس حد تک بجا تھا، غرض اس سے ہے کہ انہوں نے اس وقت کے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کو کس طرح اشعار میں بیان کر دیا۔ ہم نے اوپر 'ہم کشتگان معرکہٗ کانپور ہیں' کے کچھ اشعار پیش کیے۔ آل احمد سرور کا قول اس سلسلے میں بھی نقل کرنے کے لائق ہے کہ ''اگرچہ یہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے لیکن شبلی کے بلیغ اسلوب نے اس نظم میں ایسی آب وتاب پیدا کر دی ہے جسے وقت بھی ماند نہیں کر سکتا''[۹]۔ اور یہ بات بھی غور کے لائق ہے کہ 'جنگ یورپ اور ہندوستانی' میں شبلی کی سیاسی شاعری میں طنزیہ عنصر کا عروج ایسا ہے جو اردو شاعری کے سرمایہ میں امتیازی شان کا حامل ہے۔ سوداؔ، انشاؔ اور اکبر کی طنزیہ شاعری کے باوجود یہ نظم شبلی کے فن کی معراج ہے۔ سیاسی شاعری کا عروج یہی ہے کہ شاعری ایسی روشنی کا مینار بن جائے جو ماضی کو حال اور حال کو مستقبل کا امین بنادے اور زندگی کے خاص خاص لمحوں میں گرمی اور روشنی دیتی رہے۔

شبلی کی سیاسی نظموں پر مذکورہ بالا معروضات پیش کرنے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے شہر آشوب اور کلاسیکی عہد کی طنزیہ نظموں کی روایت سے استفادہ کیا اور روایت کی تقلید کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی جدت کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی نظموں کا احتجاج استفہامیہ ہوتے ہوئے تدبر وتفکر کی دعوت دیتا ہے۔ طنز ونشتر ہونے کے باوجود تخلیقیت سے عاری نہیں ہے۔ ان کی یہ نظمیں لطف وانبساط کے ساتھ بصیرت اور سیاسی شعور عطا کرتی ہیں۔

۹۔ رسالہ فکر ونظر سہ ماہی، مدیر شہریار، شبلی نمبر، ۱۹۹۶ء، ص ۱۵

اخبار علمیہ

دنیا کے قدیم ترین جنگل کی دریافت

جنوبی مغربی انگلینڈ (برطانیہ) کے ساحلی علاقے سمرسیٹ میں پتھر میں تبدیل ہو جانے والے اس جنگل کو دریافت کیا گیا جو چٹانوں میں چھپا ہوا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی اور کارڈف یونیورسٹی کے ماہرین نے اس قدیم ترین جنگل کے فوسل دریافت کیے۔ اس سے قبل قدیم ترین جنگل کا اعزاز نیویارک کے پاس تھا مگر برطانوی جنگل اس سے ۴۰ لاکھ سال پرانا ہے۔ اس تحقیق کے دوران ان چٹانوں کا جائزہ لیا گیا تھا جو ۴۱ کروڑ سے ۳۵ کروڑ سال پرانی ہیں۔ جنگل کی دریافت سے قبل مانا جا رہا تھا کہ ان چٹانوں میں کسی قسم کے نباتاتی فوسل موجود نہیں۔ مگر ان کا جائزہ لینے پر محققین نے درختوں کے تنوں کے آثار دریافت کیے جو کروڑوں سال پرانے تھے۔ تحقیق کے مطابق موجودہ عہد کے درختوں کے برعکس اس قدیم جنگل کے درخت کافی مختلف تھے۔ Calamophyton نامی یہ درخت دیکھنے میں موجودہ عہد کے پام درختوں جیسے تھے مگر تحقیق میں بتایا گیا کہ وہ زیادہ پتلے اور چھوٹے تھے۔ ان میں سب سے بڑے درخت کی لمبائی ۲ سے ۴ میٹر کے درمیان ہے۔ محققین کے مطابق یہ کافی عجیب جنگل ہے اور موجودہ عہد میں ایسا کوئی جنگل کہیں نہیں دیکھا گیا ہوگا۔ انہوں نے بتایا کہ ان درختوں کی جڑیں نہیں تھیں مگر تنے بہت زیادہ تھے جن کے گرنے سے اس علاقہ پر اثرات مرتب ہوئے۔ (صحیفة الوطن، بحرین ۹/۳/۲۰۲۴ء ص ۱۶)

شرائع الشرق القدیم: من حمورابی الی موسیٰ کی اشاعت

دار التکوین نے حال ہی میں ''قدیم مشرق کے قوانین: حمورابی سے موسیٰ تک'' نامی نئی کتاب شائع کی ہے۔ جس کو مصنّفین کے ایک پورے گروپ نے مل کر تصنیف کیا تھا۔ اس کا عربی میں ترجمہ اسامہ سراس اور تحقیق و مراجعت کا فریضہ فراس السواس نے انجام دیا ہے۔ یہ بابلی، سمیری اور ہیٹی قوانین کے مکمل نصوص پر مشتمل ہے۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے مقدمہ میں لکھا گیا ہے کہ ''یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق انسانی تاریخ کے پہلے تحریری قوانین سے ہے۔ یہ قوانین افراد کے درمیان انصاف اور عدل و مساوات کی بنیاد پر تعلقات کو منظّم کرنے کے لیے پہلی بار اس خطہ

میں وضع کیے گئے تھے''۔(الشرق الاوسط، ریاض، ثقافہ وفنون ۱۵/۴/۲۰۲۴ء)

چین میں ایک ہزار سال پرانے مندر کی دریافت

چین کے شمال میں واقع صوبہ شانزی کے داٹونگ شہر کے پنگچینگ ضلع میں شمالی وی خاندان (۳۸۶-۵۳۴) سے تعلق رکھنے والا ایک قدیم مندر دریافت ہوا ہے۔ نیو چائنا نیوز ایجنسی (شہنوا) کے مطابق یہ شاہی مندر ہے جو شمالی وی خاندان کے محل کے کھنڈرات سے ۳۰۰ میٹر فاصلے پر ہے۔ جب کہ اس کے مرکز میں پگوڈا برج (ٹاور) ہے۔ محققین کو پگوڈا کے وسط میں ایک گڈھا ملا ہے جس میں موتی اور مونگا کے زیورات اور تانبے کی انگوٹھیاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اندر اچھی طرح محفوظ ۲۰۰ مجسمے بھی ہیں۔ (صحیفۃ الوطن، بحرین، ۱۳/۳/۲۰۲۴ء ص ۱۶) **ک، ص اصلاحی**

صناعتی دور سترھویں صدی میں شروع ہوا

کیمبرج یونیورسٹی کی ایک نئی ریسرچ کے مطابق برطانیہ میں صناعتی دور (انڈسٹریل ایج) اٹھارہویں صدی میں نہیں بلکہ اس سے ایک صدی قبل شروع ہو گیا تھا جب مزدور زراعت چھوڑ کر صناعت کی طرف متوجہ ہوئے۔ برطانیہ میں مزدور، زراعت اور گھریلو دستی کاریگری سے ہٹ کر سترھویں صدی میں فیکٹریوں میں کام کرنے لگے تھے۔ لندن گارجین (۵/اپریل ۲۰۲۴ء) کے مطابق یہ مطالعہ متعلقہ زمانے کی ملازمتوں سے متعلق ۱۶۰ ملین دستاویزات کے مطالعے پر مبنی ہے۔ اس کے مطابق سنہ ۱۶۰۰ء سے ۱۷۴۰ء کے دوران برطانیہ میں زراعتی مزدوروں کی تعداد گھٹ کر ۶۴ فیصد سے ۴۲ فیصدی ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۷۶۰ء کے آتے آتے برطانیہ کی ۶۰ فیصد سے لے کر ۸۰ فیصد عورتیں گھر کے باہر کام کرنے لگی تھیں۔

اب تک مؤرخین نے کہا تھا کہ صناعتی دور کی ابتداء سنہ ۱۷۶۰ء سے ہوئی تھی جب ملیں اور اسٹیم انجن عام ہو گئے تھے اور کارخانوں میں کپڑے تیار ہونے لگے تھے۔ مذکورہ مطالعے کی نظر میں اس تبدیلی کی تین وجوہات تھیں: کوئلے کا استعمال، نئی ٹکنالوجی اور برطانیہ کے دنیا بھر میں پھیلے مقبوضہ علاقے۔ برطانیہ میں اس تبدیلی کے آنے سے یورپ کے دوسرے علاقوں میں بھی صناعتی دور شروع ہوا۔

(ظفر الاسلام خان)

تبصرۂ کتب

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، **داستاں میری**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع نفیس گرد پوش، صفحات جلد اول ۵۸۰ جلد دوم ۶۳۳، قیمت درج نہیں، اشاعت اول ۲۰۱۳ء دوم ۲۰۲۰ء، پتہ: جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ اور دیوبند اور لکھنؤ کے مشہور مکتبے۔ موبائل: ۹۴۵۰۸۷۶۴۶۵۔

محدث کبیر مولانا تقی الدین ندوی کا دارالمصنّفین اور معارف سے رشتہ ان کی زندگی کی داستان میں خاص اہمیت کا حامل ہے، اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت اس لیے نہیں کہ وہ خود ایک الگ داستان ہے، سننے اور سنانے کے لائق۔ مگر حیرت اور افسوس اس بات پر ہے کہ مولانا کی علمی کاوشوں اور وہ بھی حدیث شریف کی امہات کتب کے حواشی وتعلیقات اور نہایت دیدہ ریزی سے تحقیق وترتیب سے مزین اشاعتوں کا ذکر معارف میں بہت کم آیا، ظفر الامانی اور اوجز المسالک، بذل المجہود، کتاب الزہد، الجامع الکبیر (سنن ترمذی) اور الجامع الصحیح امام بخاری مع حاشیہ سہارنپوری وغیرہ کتابیں اصلاً باب التقریظ والانتقاد کی متقاضی ہیں، اس کوتاہی کی کوئی تاویل بھی نہیں کی جا سکتی۔ ان ہی کتابوں کی فہرست میں مولانا کی خودنوشت سوانح حیات، داستاں میری ہے، ہمارے سامنے اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، وہ بھی ۲۰۲۰ء کا۔

مولانا تقی الدین ندوی نے داستاں میری کا تعارف سرورق پر اس جملے سے کرایا ہے کہ ''حدیث شریف کے ایک طالب علم کی سرگزشت'' حقیقت یہی ہے کہ ان کی زندگی کی داستان، صرف علم حدیث سے عشق اور اس کی خدمت سے عبارت ہے۔ کسی بھی زندگی کے حالات دوسروں کے لیے اس لیے دلچسپ ہوتے ہیں کہ اس میں زندگی کے قریب وہی نشیب وفراز اپنا عکس دکھاتے جاتے ہیں جن سے قاری اپنی زندگی میں بھی کم وبیش دوچار ہوتا رہتا ہے۔ 'داستاں میری' ایک طالب علم کے محدث کبیر ہونے کی وہ کہانی ہے جس میں پڑھنے والے کے لیے سبق ہی سبق ہے۔ مولانا کی شہرت، ان کے عہدوں اور مناصب اور ان کی کتابوں کی کثرت اپنی جگہ لیکن مقبولیت کے اسباب بلکہ اسرار اس داستان سے اس طرح عیاں ہیں کہ کامیابی کے متلاشی طالب ہوں یا سالک سب کے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ علم تو وہی جو بزرگوں کی نظر کا عطیہ اور فیض ہو۔ پیش نظر دونوں جلدوں میں مولانا ندوی کی تعلیم وتربیت، تدریس وتالیف، گجرات میں قیام، قاہرہ کا سفر، مکہ مکرمہ اور امارات میں مستقل قیام کی

تفصیلات اگران کے ذاتی احوال وسوانح پر مشتمل ہیں تو دوسرے ابواب میں تصنیفات اور اکابر معاصرین کا ذکر ہے، ذکر میں زیادہ حصہ مولانا کے بزرگوں کے خطوط کا ہے، دوسرے حصہ میں مولانا کی زندگی کے ایک اور شاندار کارنامے یعنی جامعہ اسلامیہ اور مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی کے قیام اور پھران کی مرحلہ وار ترقی اور جامعہ اسلامیہ میں عظیم الشان علمی سیمناروں کے انعقاد کی تفصیل ہے۔ جامعہ اسلامیہ کو جنھوں نے دیکھا ہے وہی اس علمی تاج محل کی رعنائی وزیبائی کی داد دے سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ مولانا کے اسفار جو عرب سے افریقہ اور یورپ تک ہوتے رہے، ان کا مفصل ذکر ہندوستان کے مختلف شہروں کے سفر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مولانا کی بعض اہم تقریروں اور تحریروں کو بھی آخر میں شامل کر دیا گیا۔

قریب بارہ تیرہ سو صفحات پر جو کچھ ہے، اس کی جانب اشارے بھی کیے جائیں تو اس کے لیے صفحات درکار ہوں گے۔ تاہم پڑھنے والوں خصوصاً علم دین کے نئے طالب علموں کے لیے مولانا کی داستاں کا ابتدائی حصہ شاید سب سے زیادہ موثر اور دل میں بسا لینے والا ہے۔ جہاں صرف ایک ماہ کا بچہ اپنے باپ کے سایہ سے محروم ہو کر کبھی دادا اور کبھی ماموں کے لطف وکرم کی تلاش میں دن گزارتا رہا، مدرسۃ الاصلاح میں داخلہ کے بعد دس روپیہ فیس ادا کرنے کی استطاعت نہیں تھی، جس کی والدہ نے اپنے جگر گوشہ کے لیے چرخہ کات کر لحاف اور گدا بنایا ہو، جس کے المنجد خریدنے کے شوق کو ماں نے اس طرح پورا کیا ہو کہ اپنی ایک بکری بیچ دی۔ یہ سب جیسے تمام انسان کی زندگی کو خاص بنانے کے لیے ضروری عناصر ہیں۔ مولانا ندوی اب جس مقام پر فائز ہیں وہ بے شبہ حسنہ فی الدنیا کی خوبصورت تعبیر ہے۔ لیکن اس مقام تک رسائی کی داستان زندگی وقت کے نہ سمجھ میں آنے والے مزاج ورویہ ہی سے بنتی ہے۔ مولانا سید محمد رابع ندویؒ نے اس سوانح کے متعلق لکھا کہ اس کو پڑھ کر کسی شخص کے علمی شخصیت بننے میں جو مراحل آتے ہیں اور مشکلات میں سے کس طرح گزرنا ہوتا ہے، اس سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اس لیے اس داستاں میں سیکھنے اور سمجھنے کا فائدہ ہے۔ باقی بزرگوں کے نصائح، ان کے بیش قیمت خطوط اور خاص طور پر شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ کے ذکر سے یہ داستاں جس طرح معمور ہے اس سے یہ محض ایک قطرہ کے گہر ہونے کی کہانی نہیں بلکہ ان کی بھی داستان بن گئی جو جوہر شناسوں کی نظر سے ہشت پہل ہیرے بن جاتے ہیں، علم وتصوف سے جو دو آتشہ تیار ہوتا ہے اس کا لطف ان دونوں جلدوں سے خوب مل کر رہتا ہے۔

(محمد عمیر الصدیق ندوی)

مصداق اعظمی، **چھاؤں سے دھوپ تک**، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۵۶، قیمت ۳۵۰/روپے، پتہ amazon.in amazon.com اور مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، اور لکھنو، جموں، علی گڑھ، سری نگر اور پٹنہ کے مشہور مکتبے، سال اشاعت ۲۰۲۱ء، موبائل نمبر: ۹۴۵۱۴۳۱۷۰۰

اگر چہ یہ کتاب مجموعہ منظومات ہے اور وہ بھی آزاد نظم کے پیرایہ و پیراہن میں، جہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام، لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ آزاد نظموں کے ذریعہ بھی دل ودماغ کو گرفت میں لیے جانے کی توانائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ ایک تو عنوان ہی سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ عموماً زندگی کا سفر دھوپ سے شروع ہوکر کسی سایہ میں مسافر کو منزل ملنے پر پورا ہوجاتا ہے، لیکن بلال احمد مصداق اعظمی کی بلالی روح یہ اعلان کرتی ہے کہ شعر وسخن کی فضاؤں میں خدا سے اور خود سے قریب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ شاعر کے شعور کی پاکیزگی ہی ہے جس نے انتساب کے لیے رب کریم اور سرور کائنات ﷺ کی بارگاہوں پر خود کو نذر کردیا، یہی جذبہ تخیل کو تعقل میں اسی طرح بدلتا ہے کہ ہر سمت ہر جانب فقط/جلوہ آرائی ہے، تیری اس لیے/بندہ ناچیز تیرا ہر گھڑی/لاشریک وحدہ/پڑھتے ہوئے/رہے تری وحدانیت پر ہی نثار۔

خدا کے بعد جہاں سر جھکانے کی تمنا جبین کو بے قرار کرتی ہے وہ ماں کی آغوش ہے، مصداق نے اپنی ماں کی یادوں کو جو عنوان دیا وہی اس کتاب کا بھی عنوان ٹھہرا، جب تک ماں رہی تو عالم یہ تھا کہ میں جہاں بھی گیا/میں جدھر بھی گیا/چھاؤں ہی چھاؤں تھا، زندگی کا سفر/غم کی ذرہ برابر کہیں دھوپ بھی/میری راہوں میں حائل ہوئی ہی نہیں/پھر ماں نہ رہی تو آج تیرے نہ ہونے کا احساس ہے/چاند ٹوٹا ہوا اک کھلونا لگا/میرے مصرعے بھی مجھ سے خفا ہوگئے/چھاؤں سے دھوپ تک کا مرا یہ سفر/دست شفقت سے اب ترے محروم ہے۔ شاعر اگر سچ کی وادیوں میں سانس لینے لگے تو پھر فضاؤں میں احساس کی خوشبوؤں کو پھیلنے سے کون روک سکتا ہے۔ ایسے شعر یوں ہی زبان پر نہیں آتے کہ

سچ بولنے کی ضد نے امر کردیا اسے سقراط جانتا تھا پیالے میں زہر ہے

مصداق کی شاعری کا یہ شوق پرانا ہے لیکن ادھر چند برسوں میں مصداق سنجیدہ، بامقصد اور پاکیزہ شاعری کے آسمان پر ایک ایسے ستارے کی شکل میں سامنے آئے ہیں، جس کی روشنی جلد چھپ جانے والی نہیں، اس میں چمکنے اور دمکتے رہنے کی خوبیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مجموعہ نظم میں ایک نثری بیانیہ بھی ہے۔ یہ شاعر کا اپنا حسب نسب ہے لیکن اس سے زیادہ اس میں غم

جہاں کا حساب ہے۔اس حساب نے اسماء الرجال کی یاد تازہ کردی۔اردو کے چمن میں اس تازہ اور خوشگوار جھونکے سے لطف اندوز ہونا روحانی شادمانی کی ضمانت سے کم نہیں۔ **(ع۔ص)**

ظفر الاسلام اصلاحی، **مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ کی دینی و علمی خدمات۔کچھ اہم پہلو**، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۱۷۶، ملنے کا پتہ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۷۶۰۰۱ و ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت ۱۵۰ روپے۔موبائل نمبر: ۹۰۵۸۲۸۱۴۹۴۔

پہلے حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی دینی و علمی خدمات پر اصلاحی صاحب کے چند مضامین معارف اور فکر ونظر، علی گڑھ میں شائع ہوئے تھے، جن کو نظر ثانی اور قدرے اضافہ کے بعد اس کتاب میں یکجا کرکے پانچ ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔مولانا شروانی کے مختصر حالات کے بعد پہلے باب میں قرآن وعلوم قرآنی اور دوسرے میں سیرت نبویؐ سے ان کے تعلق کی داستان بیان کی گئی ہے، تیسرے میں ان کے کتب خانہ حبیب گنج سے اہل علم کی دلچسپی اور زائرین کے آرام واکرام کا ذکر ہے۔باب چہارم میں مولانا کی ایک یادگار تقریر ''سرسید کی یاد'' اور پنجم میں سرسید کے قریبی رفقاء پر مشتمل ان کے نادر مضمون ''علی گڑھ کے مردان کار'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان کے علاوہ معارف میں مولانا کی اور خود مولانا پر شائع شدہ تحریروں اور یحیٰ اعظمی کے منظوم خراج عقیدت پر مشتمل دو دلچسپ اور مفید ضمیمے شامل ہیں۔

کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دوسرے حوالوں کے علاوہ مولانا کی علمی، دینی اور ادبی سرگرمیوں کے متعلق بعض نئے اور بیش قیمت معلومات کا ماخذ مولانا کے پوتے پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کی ذات ہے جن سے مصنّف کا خاص تعلق رہا ہے۔تحقیق اور واقعیت کی تلاش اصلاحی صاحب کی تحریروں کا نمایاں جوہر ہے۔اس کے نمونے بھی جابجا بکھرے ہیں۔مولانا جیسی جامع کمالات اور پرکشش علمی شخصیت کی زندگی کے پہلوؤں کو ملک وملت کے سامنے باربار پیش کرنے میں بہ قول مصنّف بڑا سبق ہے۔ایک نسخہ میں فہرست میں دو ضمیموں کا اندراج ہے لیکن اپنے مقام پر یہ دونوں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔اعلیٰ اور بامقصد مطالعہ کے لیے یہ کتاب ایک عمدہ پیش کش ہے۔ **(کلیم صفات اصلاحی)**

ڈاکٹر شاہ محمد فائز، **مقالات پروفیسر شاہ عبدالسلام**، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۲۴۔ ۶۰۲۔۴۰۵ عدنان پلی، کانپور بائی پاس، دوبگہ، لکھنؤ، دانش محل امین آباد، لکھنؤ، سن اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۹۰ روپے۔موبائل نمبر: ۹۵۵۹۷۶۴۱۶۰۔

پروفیسر شاہ عبدالسلام کا نام علمی وادبی حلقوں میں غیر معروف نہیں ہے۔ زیر نظر علمی، تاریخی اور ادبی مضامین کے مجموعہ میں مختصر و مفصل تقریباً بیس مقالات شامل ہیں۔ اودھ میں عربی تاریخ نگاری اور فارسی کے اثرات والے مضمون میں لکھا گیا کہ ''تاریخ کے ہی زمرے میں شامل عربی زبان میں ایک تیسری کتاب جو اودھ میں ہی تصنیف ہوئی ہے وہ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف بدءالاسلام ہے'' (ص ۴۷) ایک اور مضمون میں منشی نولکشور کو ہند اسلامی ثقافت کے علم بردار کی حیثیت سے پیش کر کے لکھا گیا کہ منشی صاحب نے قرآن مجید، تفسیر و حدیث اور فقہ واسلامیات کی جس عالمگیر پیمانے پر اشاعت کی اس کی مثال عالم اسلام میں بھی مشکل سے ملے گی۔ اسی طرح ایک مضمون میں بعض اہم دواوین و مثنویات کے صحت متن کے حوالے سے نولکشور کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دیگر مضامین میں بعض اہم شخصیات کا تعارف ہے۔ نواب وزیر علی خاں وزیری کو حکمرانان اودھ کا پہلا مجاہد آزادی قرار دیا گیا ہے۔ خاص کتب خانوں کے حوالہ سے مغل حکمرانوں کی علمی خدمات کا احاطہ بھی بڑے سلیقہ سے کیا گیا ہے۔ تاریخ اودھ کے غیر معروف مآخذ میں تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ، تاریخ اقتداریہ، تاریخ حسینیہ، تاریخ آفتاب اودھ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ یہ سبھی مخطوطات اودھ کی مستند تاریخیں ہیں لیکن اب یہ گم نام ہو چکی ہیں۔ انا ماریہ شمل کے ساتھ بعض اہم اسلامی موضوعات پر اڈلبرٹ کے انٹرویو کا اردو ترجمہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ اس سے بعض اسلامی موضوعات پر جرمنی کے ایک مستشرق کے خیالات سے واقفیت ہوتی ہے۔

زیر نظر مجموعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنّف نے نئی معلومات اور دریافتوں سے قارئین کے لیے ایک قیمتی تحفہ پیش کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔ تصحیح کتابت ہر کتاب کے لیے اب زیادہ توجہ کی مستحق ہے۔ فجاع الصوت، باقائدہ، فرائز جیسی غلطیاں تو بالکل نہیں ہونی چاہئیں۔ مرتب نے اپنے والد مرحوم کے مجموعۂ مضامین کو شائع کر کے اپنی سعادت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ **(ک، ص اصلاحی)**

ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی، **حضرت خواجہ معین الدین چشتی حیات و تعلیمات**، کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات ۱۴۴۔ صفیہ اکیڈمی، جامع معین الدین چشتی، سولم پور روڈ، چندوالا، پوسٹ ایچ، ایم ٹی، اجمیر، سن اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۳۵۹۷۷۹۵۲۲۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کی سیرت و سوانح کے تعلق سے یہ ایک مختصر مگر مفید مطلب کتاب ہے۔ فاضل مؤلف نے خواجہ صاحب کی تعلیمات اور ان کی معنویت و افادیت کو دلنشین اور سادہ اسلوب میں

پیش کیا ہے۔ خواجہ صاحب پر کثرت سے تحریریں اور کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب اسی مفید سلسلے کا تازہ حصہ ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ خواجہ صاحب کی نظر کیمیا اثر سے ہزاروں انسانوں کو قبول اسلام کی توفیق ملی۔ ان کی کرامتیں بھی بے شمار ہیں، جن میں بعض کی تفصیلات اس کتاب میں بھی ہیں۔ ان کرامتوں کی شرعی حیثیت واہمیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تعلیمات کے باب میں خواجہ صاحب کی ان ہی تعلیمات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جن کا تعلق براہ راست انسان کی تعمیر سیرت سے ہے۔ مصنف نے اس سلسلہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جو شخص بھی ان پر عمل پیرا ہوگا اس کو دنیا وآخرت کی تمام پریشانیوں سے نجات بھی مل جائے گی۔ خواجہ صاحب کے اسفار کی تفصیل پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ آخر میں درگاہ خواجہ کے اہم مقامات کی قدیم وجدید تاریخ پر روشنی اس طرح ڈالی گئی ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام اور خواجہ اجمیری کی دعوتی زندگی کے سلسلہ میں مؤلف کا یہ خیال درست ہے کہ تذکرہ نگاروں نے بڑی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ **(ک۔ص اصلاحی)**

ڈاکٹر ابوعبید، **جدید عربی ادب اور ادبی تحریکات**، متوسط تقطیع کاغذ وکتابت عمدہ، مجلد مع خوب صورت گرد پوش۔ صفحات: ۴۳۱ پتہ: اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی، قیمت ۲۵۱/روپے۔ سن اشاعت ۲۰۲۰ء موبائل نمبر: درج نہیں۔

اس کتاب کا پہلا 'ایڈیشن' الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگر، نئی دہلی، سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ ہمارے سامنے ۲۰۲۰ء کا جدید ایڈیشن ہے جس کو 'اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی' نے اور بہتر انداز سے شائع کیا ہے۔ گرچہ اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں جدید عربی ادب اور مصر میں ادبی تحریکات کے وجود واثرات پر بحث کی گئی ہے، اور اس کے لیے تاریخی سیاسی اور سماجی پس منظر بھی تلاش کیے گیے ہیں۔

اصلاً یہ لائق مصنف کا 'پی ایچ ڈی' کا مقالہ ہے۔ اس تحقیقی مقالہ لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ گزشتہ صدی میں عالم عرب خصوصاً مصر میں دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں سیاسیات کے ساتھ ادب کی دنیا بھی تغیر پذیر ہوئی۔ اور اس کے جو اثرات مرتب ہوئے، اس کے نتیجے میں متعدد ادبی تحریکات سامنے آئیں۔ چوں کہ اردو زبان میں اس وقت تک اس موضوع پر کوئی باقاعدہ محققانہ کوشش نہیں کی گئی تھی، اس لیے مصنف نے اپنے اس تحقیقی مقالہ کے لیے اس موضوع کا بجا طور پر انتخاب کیا۔ مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑی حد تک موضوع کا حق ادا کر دیا، البتہ منطقی نتائج اخذ کرنے میں احتیاط کی جگہ انشاء پردازی نے لے لی ہے۔ جیسا کہ آخری باب میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

مصر پر عثمانی تسلّط کے بعد چوں کہ عربی زبان کے بجائے ترکی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا[۱]، لہٰذا تعصب اور عدم توجہی کا شکار ہوکر یہ دکھیاری زبان جمود کا خول پہن کر گم نامی کے اس اندھے غار میں جا پڑی، جہاں سے اس کے کراہنے کی آواز بھی باہر نہیں آرہی تھی۔اسی حالت میں صدیاں بیت گئیں ،مگر اس دکھیاری زبان کے زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔تاہم اٹھارویں صدی کے اختتام پر جب مصر میں بونا پارٹ کی توپوں کی گھن گرج گونجی تو اس میں بھی ارتعاش پیدا ہوا۔بونا پارٹ بہت مختصر سی مدت تک مصر میں مقیم رہا ،مگر جاتے جاتے اس دبی کچلی ، ناخواندہ اور بے بس مصری قوم کو آزادی کی حقیقت اور زندگی کا مقصد بتا تا گیا۔

اس اقتباس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت عثمانیہ ایک ظالم حکومت تھی ،جس نے عربی زبان ، جو مسلمانوں کی مذہبی زبان بھی تھی ، اس کے ساتھ بے جا تعصب اور بے توجہی کا معاملہ برتا ، نیز اس کو بے وقعت بنا دیا۔صدیاں گزرنے کا دعویٰ بھی دلیل کا طالب ہے۔سامراجی 'بونا پارٹ' یعنی نپولین' جو حملہ آور اور غاصب وقابض بن کر آیا ، وہ مصنف کی نظر میں اس لیے محسن بن گیا کہ بہت کم وقت میں جاتے جاتے خوابیدہ مصری قوم کو وہ بیدار کرگیا۔الغرض ، جدید عربی 'زبان وادب' کی جو روشنی پھیلی وہ اسی نپولین اور فرانسیسی قوم اور اس کے مزاج اور اس کی ثقافت کی دین ہے۔اس دعویٰ پر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ، واقعہ یہی ہے یا پھر یہ فکر استشراقی ذہن کی اپج معلوم ہوتی ہے۔لائق مصنف مدرسۃ الاصلاح جیسی تربیت گاہ کے پروردہ ہیں ، وہاں روایت کے ساتھ درایت پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

اس کتاب میں جابجا عربی اصطلاحات کو من وعن نقل کر دیا گیا ہے ۔ان کے ترجمہ وتوضیح کی ضرورت کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے، مناسب تھا جو اصطلاحات خالص علمی تھیں، ان کا اردو ترجمہ کر دیا گیا ہوتا۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اصطلاحات عام طلبہ وقارئین کی فہم کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہیں۔مثلاً : التفکک،الاحالة ،التقلید،الولوع بالاعراض دون الجوهر وغیرہ۔

ایڈیشن نیا ہے ،مگر کتابت کی غلطیوں پر نئی نظر نہیں کی گئی ہے اس لیے شستہ کو ششتہ ،مفکرین کو مکفرین ، ملکہ کو ملکے دیکھنا پڑتا ہے۔　　　　**(فضل الرحمٰن اصلاحی)**

۱۔مصر پر عثمانیوں کا قبضہ سنہ ۱۵۱۷ء میں ہوا۔محمد علی پاشا نے ۱۸۰۵ء میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد ترکی زبان کو مصر کی سرکاری زبان کے طور سے نافذ کیا (کیوں کہ اسے صرف ترکی آتی تھی) لیکن اسی کے ساتھ عربی بھی سرکاری زبان کے طور سے استعمال ہوتی رہی۔ترکی زبان صرف حاکموں اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی زبان رہی جو زیادہ تر ترکی النسل یا غیر مصری تھے جب کہ عوام کی زبان عربی ہی رہی۔۱۹۲۲ء میں مصر کے برطانوی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد عربی پوری طرح سرکاری زبان بن گئی اور ترکی زبان کا خاتمہ ہوگیا۔حالاں کہ وہاں ترکی النسل لوگ باقی رہے لیکن انھوں نے عربی زبان پوری طرح سے اپنالی۔انہیں میں عربی کے معروف ادیب یحییٰ حقی (م:۱۹۹۲) شامل ہیں۔(ظفر الاسلام خان)

قلم کی عظمتِ رفتہ کی شان: طارق غازی[۱]

علیزے نجف

alizeysikander@gmail.com

بچھڑنا تیرا ہے یوں تو مشیتِ ربی
فنا یہاں پہ ہر اک فرد کا مقدر ہے

ازل سے ہی ہے تغیر پزیر یہ دنیا
بدلتے رہتے ہیں اوراق ہر زمانے کے

بدلتی رہتی ہے تصویر بھی یہ سطحِ زمیں
بچھڑنا پھر بھی ترا ہم پہ شاق گزرا ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ تیرے جانے سے
نہ جانے کتنی ہی شاموں کی چھن گئی رونق

جو تیرے لمس کے عادی رہے وہ لوح و قلم
بکھر گئے ہیں کہ جیسے ہوں وہ بھی نوحہ کناں

وہ راستے جو تھے مانوس تیرے قدموں سے
وہ منتظر ہیں ترے، پر انہیں بتائے کون

کہ بڑھتی جائے گی ہر لمحہ انتظار کی حد
ہے دل اداس، نظر کھوئی ہے خلاؤں میں

کہ جیسے ڈھونڈ رہی ہو وہ تیرا نقش قدم
نظر کے سامنے برپا عجیب محشر ہے

چراغ جل تو رہے ہیں ، پہ روشنی گم ہے
ترے بغیر ہے جیسے گھٹن فضاؤں میں

تمام عمر تخیل کے دشتِ ویراں میں
چراغ دہر کی مانند تو رہا روشن

قلم کی عظمتِ رفتہ کی شان تھی تجھ سے
وہ علم و فہم وراثت میں جو ملے تجھ کو

سنبھال کر رکھا تا عمر بانکپن ان کا
قلم کے غازی کے تجھ میں تمام تھے اوصاف

شعورِ ذات کی پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے
زمانے بھر کے نشیب وفراز سے گزرا

۱۔ ممتاز صحافی، ادیب اور شاعر طارق غازی کا کنیڈا میں ۱۳/اپریل ۲۰۲۴ء کو انتقال ہوگیا۔ موصوف ۱۹۴۵ء میں بجنور میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ۲۸/سال تک سعودی گزٹ سے منسلک رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد کنیڈا میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ کئی انگریزی اور اردو کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ معارف میں ان کا کلام وقتاً فوقتاً شائع ہوا ہے (ادارہ)

جو دل پہ گزری ترے ، اور جو کیا محسوس
اسی سے سینکڑوں صفحے سیاہ کر ڈالے
ہزار ذہنوں کی قسمت سنوار دی تو نے
خلوص و جہدِ مسلسل سے ، علم و حکمت سے
وہ چہرہ جو کہ علامت تھا دردمندی کی
وہ لہجہ جو کہ تحمل کا پاس دار رہا
وہ کھو گیا ہے ، نگاہوں سے ہوگیا اوجھل
زباں ہے سکتے میں اور اک خلش سی ہے دل میں
عجب سا کرب ہے زورِ بیان کے اندر
کسے بتاؤں کہ ہوں تیر ہجر سے زخمی
کرے گا کون مرے درد کی مسیحائی
اگرچہ مرگ اچانک نہ تھی تری لیکن
مگر یہ دل ہے مرا مانتا نہیں اب تک !
ترا وصال خسارہ ہے ملک و ملت کا
کہ تیری نوکِ قلم میں نہاں تھا قوم کا درد
کہوں میں کیسے کہ تیرا قلم شکستہ ہوا !

رکھے خدا تجھے اپنے جوارِ رحمت میں
عطا ہر ایک ہو موعودہ نعمتِ یزداں

☆

اشک ہای غم

(شریک حیات کے سانحۂ ارتحال پر)

وارث ریاضی

کاشانۂ ادب، سکٹا (دیوراج) پوسٹ: بسوریا، وایا۔ لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔۸۴۵۴۵۳

یہ جہانِ رنگ و بو ہے ، جلوہ گاہِ بے ثبات
چند لمحوں کے لیے ہے رونقِ بزمِ حیات
سن رہا ہوں میں ازل سے قصۂ موت و حیات
جز خدائے لم یزل فانی ہے ساری کائنات
مرکب گل پر رواں ہے آرزوؤں کی برات
پھول کی پتی سے بھی نازک ہے انساں کی حیات
انبیا ہوں یا کوئی مردِ خدا روشن صفات
موت کے کرب والم سے کس نے پائی ہے نجات
زندگی ہے غنچہ و گل کے نکھر جانے کا نام
موت ہے گل زارِ ہستی کے بکھر جانے کا نام
اے بہارِ زندگی ، اے روحِ اخلاص و وفا
اے سراپاے محبت ، پیکر صبر و رضا
تیری ہستی تھی بہشتِ آرزو میرے لیے
باعثِ تسکینِ دل ، اے نیک خو میرے لیے

تھی تمناؤں کے گلشن میں ترے دم سے بہار
اے کہ تھا تیری نگاہِ لطف سے میرا وقار

کون اب دنیا میں ہوگا میری خاطر بے قرار؟
میرے جانے پر کہیں، کس کو رہے گا انتظار؟

میری لغزش پر کبھی آنسو بہا دینا ترا
یاد ہے فرطِ خوشی میں مسکرا دینا ترا

تجھ کو بخشا تھا خدای پاک نے وہ دردِ دل
آخرت کے خوف سے رہتی تھی ہر دم مضمحل

جس قدر شادی میں تحفے میں تجھے زیور ملے
خوفِ عقبیٰ سے انہیں خیرات تم نے کر دیے

میں بہت بچہ تھا، سر سے باپ کا سایہ اٹھا
جب جواں میں ہوگیا، ماں بھی ہوئیں مجھ سے جدا

تونے پیری میں مری، توڑا ہے پیمانِ وفا
کیا بچا میرے لیے کچھ اب ترے غم کے سوا؟

دل ہے یک سر مضطرب، آنکھیں مسلسل اشک بار
آج تک دیکھی نہ ایسی گردشِ لیل و نہار

لاکھ بہلاتا ہوں دل، لیکن بہلتا ہی نہیں
ہجر کا یہ جاں ستاں موسم بدلتا ہی نہیں

تو تنفس کی مریضِ ناتواں ہر دم رہی
مدتوں سے سانس آسانی سے لے سکتی نہ تھی

تیری بیماری کی خاطر ٹھوکریں کھاتا رہا
لے کے امید شفا، میں دل کو بہلاتا رہا

آخرش وہ ساعتِ اندوہ گیں بھی آگئی
جسمِ لاغر پر ترے، رحمت خدا کی چھا گئی

اے کہ تھی دل میں ترے قرآں کی عظمت بے پناہ
تھا زباں پر موت کی شدت میں ذکرِ لاالٰہ

روز اول سے کسی نے آج تک سمجھا ہے کیا؟
چھین لیتا ہے متاعِ زیست کیوں دے کر خدا؟

تیری رحلت پر ترے حسان[1] وعرفاں[2] سوگوار
راشدہ[3]، عدنان[4] و مدحت[5] فرطِ غم میں بے قرار

تیری بیٹی اُمِّ ہانی[6] تیری فرقت میں حزیں
کیا خبر ہے تو کہاں اب ہوگئی خلوت گزیں؟

ہے خیال و خواب لطفِ زندگی تیرے بغیر
راس آسکتی نہیں کوئی خوشی تیرے بغیر

بیس سو چوبیس میں اے وارثؔ گریہ کناں
ساجدہ ۲۰۲۴ء بھی چل بسیں اب سوے گل زار جناں

☆

۱۔ چھوٹا بیٹا ۲۔ بڑا بیٹا

۳۔ چھوٹی بیٹی ۴۔ نواسہ

۵۔ نواسی ۶۔ بیٹی

معارف کی ڈاک

کریمہ صبغۃ اللہ اوران کی مرتبہ کتاب میں دارالمصنّفین ومعارف کے حوالے

نامور محقق اور ممتاز اسکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کی بھتیجی محترمہ کریمہ صبغۃ اللہ صاحبہ (۱۲/مارچ ۱۹۴۱ء۔۳۱/جنوری ۲۰۲۴ء) کی وفات پر معارف (اپریل ۲۰۲۴ء) کے شذرات میں مختصر نوٹ نظر سے گذرا تو ان کی مرتبہ کتاب ''مکتوباتِ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب'' کے اوراق ذہن کے پردے پر گھوم گئے۔اطیب اردو کمپیوٹر گرافکس، حیدرآباد سے ۲۰۱۸ء میں مطبوعہ یہ کتاب تقریباً دو برس قبل مولانا مختار احمد ندوی صاحب (ناظم مدرسہ تعلیم النساء، جلگاؤں، مہاراشٹرا) کی عنایت سے ناچیز کو موصول ہوئی تھی۔خطوط کے مجموعوں سے راقمِ عاجز کو ذاتی دلچسپی ہے، وہ بھی علم کے بے لوث خادم اور علومِ اسلامیہ کے بحرِ زخّار کے شناور ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کے خطوط کا مجموعہ (جن کی تحریریں پڑھنا علم میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اور علمی کاوشوں کو جِلا بخشتا ہے)۔کتاب دیکھ کر مطالعہ کی دلچسپی بڑھتی ہی گئی اور رفتہ رفتہ اسے پڑھ ڈالا۔علمِ قرآن، حدیث، سیرتِ نبوی ﷺ، تاریخ اسلام، تذکرہ وسوانح سے متعلق بہت سی قدیم و جدید کتب اور ان کے بیش بہا ذخائر (کتب خانوں) کے بارے میں قیمتی معلومات ملنے کے علاوہ اس مجموعہ مکتوبات سے خود مکتوب نگار گرامی کی شخصیت اور ان کی دینی وعلمی خدمات کے کچھ عبرت ناک اور نادر پہلو بھی سامنے آئے۔پیش لفظ کے شروع ہی میں محترمہ کریمہ صبغۃ اللہ صاحبہ نے اپنے چچا محترم کی شخصیت اور علمی خدمات کا جو دلکش و جامع سراپا پیش کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔خود ان کے الفاظ میں:

> قدرت کی بنائی ہوئی کئی حسین چیزوں میں مختلف رنگوں سے مل کر بنی ایک چیز قوس قزح بھی ہے جو اپنی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اپنی الگ پہچان بھی رکھتی ہے۔اسی طرح محترم چچا ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب مرحوم نے قرآن مجید، سیرت نبویؐ، احادیث النبیؐ، غزوات ومکاتیب النبیؐ اور مخطوطات وغیرہ کی تدوین و اشاعت کے سلسلہ میں جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اپنی الگ پہچان بھی رکھتی ہیں۔آپ کی اِن دینی خدمات کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو عالمی شہرت عطا کی ہے، اس عالمی شہرت کے باوجود آپ نے سیدھی سادی زندگی گزاری، خودنمائی، شان، غرور اور تکبر سے خود کو

کافی دور رکھا۔ آپ نے خود کے لیے ناچیز، نیاز مند، مخلص، فقیر حقیر اور خادم جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں (مکتوبات ڈاکٹر حمید اللہ صاحب، مرتبہ کریمہ صبغۃ اللہ، ص ۲/ پیش لفظ)۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم بلاشبہ مطالعہ و تحقیق کے میدان میں امتیازی حیثیت کے مالک اور علم و فضل کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ تواضع وانکسار کے پیکر تھے۔ اس کی مزید شہادت اسی پیش لفظ میں مذکور اس واقعہ سے ملتی ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۴ء میں ایم۔ اے کی تکمیل کے بعد محترمہ کریمہ صاحبہ نے اپنے چچا محترم کی حیات و خدمات پر پی ایچ۔ ڈی کرنے کا رادہ کیا اور ان سے اجازت چاہی تو جواب میں چچا جان کی منکسر المزاجی ان الفاظ میں جلوہ گر ہوئی: ''مقالہ مُردوں پر لکھا جاتا ہے اور ابھی تمھارا'' چھوٹے چچا'' زندہ ہے'' (مکتوبات ڈاکٹر حمید اللہ صاحب، ص ۳/ پیش لفظ)۔

محترمہ کریمہ صاحبہ (جو ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کے سب سے بڑے بھائی جناب محمد صبغۃ اللہ (م: ۲۱/ فروری ۱۹۶۵ء) کی صاحب زادی تھیں) اعلیٰ تعلیم سے آراستہ، اخلاقِ عالیہ سے مزیّن، تدریسی مشغلہ سے منسلک، ایک علم دوست خاتون تھیں۔ اپنے چچا محترم کے علمی سرمایہ کے ایک قیمتی حصے (مکاتیب) کا تحفظ، ان کی ترتیب و تدوین واشاعت کا اہتمام ان کی علم دوستی ہی کا ایک مظہر ہے۔ مزید یہ کہ اس علمی خدمت کو انجام دیتے ہوئے انہیں بعض لوگوں کے ناروا سلوک اور تکلیف دِہ رویہ کا سامنا کرنا پڑا، اسے انہوں نے اپنے قابلِ صد احترام چچا کی محبت اور علم کی خدمت میں بخوشی گوارا کیا، جیسا کہ کتاب کے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت محترمہ کریمہ صاحبہ کو اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین ثمّ آمین۔

ان سب امور کے علاوہ مرحومہ کے مرتبہ مجموعۂ خطوط سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم ''معارف'' کے قلمی معاونین میں سے تھے، بلکہ اس سے یہ حقایق بھی منکشف ہوتے ہیں وہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اور اس کے ترجمان ''معارف'' کے بڑے قدرداں تھے۔ اس میں شائع ہونے والے تحقیقی مضامین (بالخصوص ناظم دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندویؒ اور رفقائے ادارہ کی تحریروں) کو پسند کرتے، ان سے اپنے تحقیقی مطالعات میں فایدہ اٹھاتے، ان کا حوالہ دیتے تھے۔ مزید عبرت کی بات یہ کہ معارف کو قلمی تعاون دیتے رہنے اور ایک نامور محقق و مصنف ہونے کے باوجود وہ اس کا زرِتعاون بڑی پابندی سے ارسال فرماتے تھے اور حیدرآباد میں سکونت پذیر اپنے منجھلے بھائی جناب حبیب اللہ صاحب

(م: ۱۹۷۷ء) کو اس کے لیے برابر یاد دہانی کراتے رہتے۔ پیشِ نظر کتاب میں ''معارف''، مطبوعاتِ دارالمصنّفین اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے متعلق حوالے زیادہ تر ان کے برادر مکرم جناب حبیب اللہ صاحب (جو غالباً حیدر آباد میں کتابوں کی کسی کمپنی کے منتظم تھے) کے نام تحریر کردہ خطوط میں ملتے ہیں، یہ حوالے اس نوعیت کے ہیں: ''اس [معارف] کے نہج کا کوئی (رسالہ) نہیں ہے'' (مکتوباتِ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب، ص ۶۵)۔ ''معارف'' کا چندہ ختم ہوگیا ہے۔ براہِ کرم ایک سال کا چندہ اعظم گڑھ بھیج کر نام کے صحیح املا سے بھی مطلع کریں'' (حوالۂ مذکور، ص ۹۸)۔ ''معارف'' اعظم گڑھ ابھی انہیں آیا ہے'' (حوالۂ مذکور، ص ۲۸۶، ۱۷۰)۔ کبھی پیرس سے باہر طویل سفر پر ہوتے تو ''معارف'' کی ترسیل کے لیے متعلقہ شہر کا پتہ لکھ کر بھیجتے (حوالۂ مذکور، ص ۲۸۴)۔ ''معارف'' کے مطلوبہ شماروں کی فرمائش اس طور پر کرتے تھے: ''میں نے ''معارف'' کو لکھا تھا کہ اپریل ۱۹۵۱ء میں دانتے کی طربیہ نظم ''طربیہ ربّانی'' کے عنوان سے مضمون چھپا ہے، مگر رسالہ نہیں آیا۔ کیا پرچہ فراہم ہوسکتا ہے؟'' (حوالۂ مذکور، ص ۸۴)۔ ''رسالہ معارف کا جنوری (۱۹۵۳ء) کا پرچہ ابھی ابھی آیا ہے، اس میں ایک مضمون (رومی قانون اور اسلامی قانون کے تعلقات پر چند ملاحظات) چھپا ہے۔ گر ممکن ہو تو اس کے تین پرچے (شمارے) خرید کر ارسال فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی جائے'' (حوالۂ مذکور، ص ۱۰۷)۔ ''کوئی پندرہ بیس سال ہوئے ''معارف'' میں سید صاحب نے امریکا کے مسلمانوں کی طرف سے کولمبس سے قبل دریافت پر ایک مضمون لکھا تھا۔ معلوم نہیں یہ پرچہ بزم ادب سے دستیاب ہو سکے گا یا نہیں؟'' (حوالۂ مذکور، ص ۱۲۳)۔

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس مکتوب میں مذکور مضمون (کولمبس سے پہلے امریکا کی دریافت) سہواً سید صاحب مرحوم سے منسوب ہوگیا ہے۔ دراصل معارف (اگست ۱۹۲۶ء) کے شذرات میں مولانا سید ریاست علی ندویؒ رفیقِ دارالمصنّفین نے ایک امریکی جرنل ورلڈ ٹو ڈے (World Today) کے حوالے سے اس جدید تحقیق کا ذکر کیا تھا جو اصلاً ہارورڈ کے محقق لیو وینیر (Leo Wienere) کی کتاب ''افریقہ اور اکتشافاتِ امریکہ'' پر مبنی تھی۔ بعد میں اگست ۱۹۲۷ء کے معارف میں امریکی رسالہ کے انگریزی مضمون کی اردو تلخیص (از سردار محمد، اسسٹنٹ پروفیسر کیمسٹری، زراعتی کالج، لائل پور) ''امریکہ کولمبس سے پہلے معلوم تھا'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ ایک

دوسرے مکتوب میں معارف کے ایک دوسرے مضمون کے بارے میں یہ استفسار ہے: ’’پندرہ بیس سال قبل خیال پڑتا ہے کہ معارف میں سلیمان ندوی صاحب کا ایک مضمون چھپا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آزر (قرآنی) اور تارح (بائبل کا) ایک ہی چیز ہیں، اگر کبھی یہ دستیاب ہو تو مقالہ کا خلاصہ باعثِ نوازش ہوگا‘‘ (حوالۂ مذکور، ص ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۵۰) [’’آزر‘‘ سے متعلق سید صاحب کا یہ مضمون معارف کے دوسرے شمارہ (۲/۱، اگست ۱۹۱۶ء، ص ۵۔۱۱) میں شائع ہوا تھا] ۔بعض دفعہ اپنے مکتوب میں ’’معارف‘‘ میں شائع شدہ کسی مضمون پر نقد و تبصرہ بھی فرماتے (حوالۂ مذکور، ص ۱۶۷)۔ مزید براں مطالعہ و تحقیق کے دوران دارالمصنّفین کی بعض کتب سے استفادہ کی طلب اس طور پر پیش کرتے تھے: ’’سیرۃ النبیؐ از شبلی، سلیمان ندویؒ کی غالباً جلد چہارم جس میں منصبِ نبوت سے بحث ہے، بذریعہ سمندری ڈاک اگر وہاں مل سکتی ہو تو روانہ فرمائیں‘‘ (حوالۂ مذکور، ص ۲۴۶، ۲۴۸)۔ایک خط میں اپنے بھائی صاحب سے یہ التماس کرتے ہیں کہ دارالمصنّفین سے مطبوعہ جناب سعید انصاریؒ کی کتاب (ملتقط جامع التاویل لمحکم التنزیل لابی مسلم الاصفہانی) میں دیکھیں کہ اس میں نسخ سے متعلق آیات کی کیا تفسیر کی گئی ہے (حوالۂ مذکور، ص ۲۸۵)۔

ان سب تفصیلات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی نگاہ میں ’’دارالمصنّفین اور اس کی مطبوعات بالخصوص ’’معارف‘‘ کی جو قدر و منزلت تھی اس کے بہت سے نقوش محترمہ کریمہ صاحبہ کے مرتبہ مجموعۂ مکتوبات میں ملتے ہیں۔

اس مجموعۂ مکاتیب میں مرحومہ کے نام ڈاکٹر صاحب کے تین خطوط شامل ہیں، ان میں ایک خط خاص اہمیت کا حامل ہے جسے انہوں نے ہجری سن کے آغاز سے متعلق برادرزادی کے سوال کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔تقریباً چار صفحات پر مشتمل یہ خط ایک مضمون کی شکل اختیار کر گیا تھا (حوالۂ مذکور، ص ۲۵۹۔۲۶۲)۔اپنی بھتیجی کے نام خطوط میں ڈاکٹر صاحب نے جن الفاظ (مثلاً ’’عزیز از جان کریمہ بیگم‘‘) سے انہیں خطاب کیا ہے (حوالۂ مذکور، ص ۳۱۲)، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ان سے کیسی شفقت و محبت فرماتے تھے اور انہیں کس قدر عزیز رکھتے تھے۔ارادے کے باوجود وہ اپنے شفیق چچا پر پی ایچ۔ڈی نہ کر سکیں، البتہ ان کے مکتوبات کا مجموعہ، ان پر ایک کتاب ’’چچا ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ علیہ‘‘ (مطبوعہ انوار آفسیٹ پرنٹرس، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء) اور حدیث و سیرت نبویؐ پر اپنے دادا

مولانا خلیل اللہ مرحوم کی دو کتابوں کی اشاعت کی سعادت انہیں نصیب ہوئی۔ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی
اسلام منزل، اقراء کالونی، علی گڑھ
zafarul.islam@gmail.com

معارف میں کتابت کی اغلاط

معارف، اپریل ۲۰۲۴ء بالکل بروقت ملا، یہ تن دہی اور پابندی وقت لائق تحسین ہے۔ پرچے میں ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب کا مراسلہ پڑھا جو معارف میں طبع شدہ ان کے ایک مضمون کی کتابت کی اغلاط سے متعلق ہے (پس منظر اس خط میں مذکور ہے)۔آپ خود چونکہ دہلی میں صاحب فراش ہیں اور پرچے کے معاملات اعظم گڑھ میں دیگر احباب دیکھتے ہیں اور پرچہ تیار کرتے ہیں، اس لیے انھیں اس جانب متوجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جب کوئی مضمون نگار اپنا مضمون کمپوز کرکے اور پروف خوانی کرکے بھیجتا ہے تو اسے دوبارہ کس لیے کمپوز کیا جائے؟ Word سے Inpage میں منتقل کرنا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اس کے برعکس بھی بسہولت ہو جاتا ہے۔ معارف کے اگلے شمارے کے اداریے میں وضاحت ہونی چاہیے کہ مضمون نگار کیا کریں؟ کیا وہ ہاتھ سے مضمون لکھ کر بھیجیں؟ اب شاید ہی جدید نسل کا کوئی لکھاری قلم اور کاغذ سے لکھتا ہو۔حتی مجھ جیسے قدما بھی کمپیوٹر پر براہ راست ہی کمپوز کرتے ہیں۔

خود مجھے بھی معارف سے وہی شکایت ہے جو ڈاکٹر اصلاحی صاحب کو ہے۔اپریل کے اِسی شمارے میں میرا بھی ایک خط شائع ہوا ہے۔ میں نے اس خط کی ورڈ میں کمپوز شدہ فایل بھیجی تھی لیکن معارف نے اسے دوبارہ کمپوز کروایا اور اس چندسطری خط کا پروف بھی نہیں پڑھا۔ چنانچہ اس میں کئی غلطیاں درآئی ہیں۔

میں نے لکھا تھا ''انھیں گلستان سعدی''، معارف نے اسے ''نہیں گلستان سعدی'' کردیا ہے۔

میں نے لکھا تھا ''شاہجہان کی بیٹی''، معارف نے اسے ''شاہجہان کی بنی'' کردیا ہے۔

میں نے لکھا تھا ''دکتر مہدی بیلاقی''، معارف نے اسے ''دکتر مہدی بیلاقی'' کردیا ہے۔اسی

سطر میں مجلّے کا نام ''نامہ بایسنغر'' آپس میں گڈ مڈ ہو گیا ہے۔

میں نے آخری سطر میں دیوان خجند کو واوین ''''' کے اندر لکھا تھا، معارف نے یہ واوین ہٹا دیئے اور اسی سطر میں آگے چل کر اپنی طرف سے ''دیوان کمال خجندی کے شروع میں تو واوین ڈال دیئے لیکن خاتمے پر ڈالنا بھول گئے۔

یہ نہایت ہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں اور ان کا تذکّر مجھے زیب نہیں دیتا۔ لیکن معارف کے قدیم معیار کی پاسداری اور محبت نے خاموش نہیں رہنے دیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ کا عملہ کمپوز شدہ مضامین سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے، البتہ اگر کسی مطلب اور بات کی وضاحت مطلوب ہو تو مضمون نگار سے قبل از اشاعت استفسار کر لیا جائے۔ کمپوز شدہ مضامین کی از سر نو کمپوزنگ کو پروف خوانی کے لیے دوبارہ مضمون نگار کو بھیجنے کی صلاح سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ یہ بے چارے مضمون نگار کو ایک بار پھر زحمت میں مبتلا کرنے کا باعث ہوگا اور اس کے صبر اور قیمتی وقت کا امتحان بھی۔

عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

تفسیر نظام القرآن

معارف، مارچ ۲۴ء میں جناب کلیم صفات اصلاحی نے اپنے مضمون ''تفسیر نظام القرآن کے بعض تاریخی پہلو' میں لکھا ہے کہ ''تاریخ القرآن مولانا (فراہیؒ) کی دل چسپی کا خاص موضوع تھا۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک کتاب خاص اسی عنوان سے لکھی تھی......لیکن افسوس کہ اس کے متعلق اب تک مختصر معلومات ہی دستیاب ہوئی ہیں۔'' (ص ۷) اس پر انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ 'ذکر فراہی' میں 'غیر مطبوعہ مسوّدات' کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'تاریخ القرآن' میں دس عناوین قائم کئے گئے ہیں۔ اور آخر میں لکھا گیا ہے ''مسودہ نہیں ہے مبیضہ ہے، جس کے کل ۵ صفحات ہیں'' (ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ذکر فراہی ۲۰۰۱ء ص ۶۴۸، ۶۴۹)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا فراہیؒ نے ابھی صرف اس کتاب کا خاکہ ہی وضع کیا تھا۔ اسے لکھ نہیں سکے تھے۔

اسی مضمون میں آگے لکھا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو ایک عیسائی نے قتل کیا تھا (ص ۲۱)۔ مولانا فراہیؒ

نے نظام القرآن (عربی) میں نصاریٰ لکھا ہے، جس کے اردو ترجمے میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے لکھا ہے کہ "آپ کو ایک عیسائی نے شہید کیا" (نظام القرآن ۱۹۹۹ء، ص ۲۹۹)۔ اس پر عرض یہ ہے کہ تاریخ اسلام کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو جانتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو فیروز ابولولو نے شہید کیا تھا، جو نصرانی یا عیسائی نہیں تھا، بلکہ ایک مجوسی تھا جیسا کہ عباس محمود عقادؒ نے 'عبقریۃ عمر' میں تحریر کیا ہے "....فالمعلوم ان عمر مات بطعنات من خنجر فیروز "ابی لوء لوء" من سبایاالفرس بالمدینة"۔ ایسے ہی علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنی 'الفاروق' میں لکھا ہے "مدینہ منورہ میں فیروز نامی ایک پارسی غلام تھا، جس کی کنیت ابولولوتھی" (الفاروق حصہ اول ۲۰۱۲ء، ص ۱۷۰)۔

اگر فاضل مضمون نگار نے مولانا فراہیؒ واصلاحیؒ کے اس تسامح پر اپنے مضمون میں یہ ضروری حاشیہ لگایا ہوتا، تو اس سے برسوں سے شائع ہونے والی اس غلطی کی اصلاح ہوجاتی۔

ایسے ہی اسی شمارے میں ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کا ایک بڑا معلوماتی مضمون 'جز اور جزو کی بحث' نظر نواز ہوا ہے۔ اس مضمون میں دو جگہ تسامح معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً: فاضل مضمون نگار نے ایک جگہ لکھا ہے "ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی طرح "عضو" کی مانند اس کا تلفظ نہیں کرتا تھا" (ص ۴۱)۔ عضو مذکر ہے، اس لیے "عضو" کی مانند، کی جگہ، عضو کے مانند ہونا چاہئے تھا۔ پہلے ذہن میں آیا کہ کہیں کاتب کا سہو تو نہیں ہے، لیکن جب فاضل مضمون نگار کی ارسال کردہ 'پی ڈی ایف کاپی' کی مراجعت کی تو اس میں بھی بعینہ یہی مرقوم ہے۔

اسی مضمون میں ایک جگہ لکھا گیا ہے ".....ان میں دوسرے شعر کا مصرعہ ثانیہ ہے" (ص ۴۵)۔ آنجناب نے اپنے اس مضمون کے شروع میں لکھا ہے "رشید حسن خاں نے اردو املا میں البتہ اس لفظ پر لکھا، مگر وہ دراصل صدیقی صاحب کے مضمون سے مستفاد ہے اور خان صاحب نے اس کا حوالہ بھی دیا ہے" (ص ۳۷)۔ انھی رشید حسن خاں کی تحقیق کے مطابق مصرع کو مصرعہ لکھنا درست نہیں ہے۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "کچھ لفظ ایسے ہیں جن کے آخر میں اصلاً ہائے مختفی نہیں مگر ان کے آخر میں خواہ مخواہ شامل کردی جاتی ہیں، جیسے "مصرعہ" معہ، موقعہ، موضعہ۔ ان کی صحیح صورت: مصرع، مع، موقع، موضع ہے" (اردو املا ۱۹۷۴ء، ص ۳۱۲)۔

اسی طرح فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے "اس موضوع پر راقم کے محدود علم کے مطابق کوئی اور

با قاعدہ تحریر سامنے نہیں آئی‘‘۔اس ضمن میں برسبیل تذکرہ یہ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بھی ’’املا نامہ‘‘ میں جزو، جز کی بحث پر مختصراً روشنی ڈالی ہے (مکتبہ جامعہ،۱۹۷۴ء،ص۵۳)۔

فضل الرحمٰن اصلاحی

islahi1980@gmail.com

دارالمصنّفین کی کتابیں

دارالمصنّفین کی علم پروری، ادب نوازی اور عشوہ سنجی سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ یہ علم وفن کا استعارہ اور محبت کا گہوارہ ہے جس کی صوری ومعنوی زیارت کا ہر تعلیم یافتہ خواہش مند رہتا ہے۔البتہ اس کی معنوی سیر کا بہترین ذریعہ اس کی کتابوں کا مطالعہ ہے۔میں بھی اس ادارے کی حتی المقدور یہی معنوی سیر کرتا رہتا ہوں اور شملۂ علم وعرفاں کو دراز کرتا رہتا ہوں، نیز ان میں حکمت ودانائی کے بکھرے موتی اور مروارید ناسفتہ سے اپنے دامن فکروتحقیق کو سجاتا رہتا ہوں۔اسی کی ایک درخشاں مثال ’’اسلامی نظامِ تعلیم‘‘ نامی کتاب ہے جو تعلیمات سے بالخصوص اسلامی تعلیمات سے شغف رکھنے والوں کے لئے رہنما خطوط فراہم کرتی ہے اور اپنی مفید وانوکھی معلومات نیز حوالہ جات سے مزین ہونے کے سبب اس راہ کے راہی کے لئے خضر راہ ہے۔اس کتاب کے صفحہ ۱۵۶-۱۵۷ اور ۱۵۸ پر بطور حوالہ پیش کردہ فارسی کے ضروری اور طویل غیر مترجم اقتباسات کے تعلق سے یہ عامیانہ سطریں پیش خدمت ہیں۔

فارسی کے متعلق زبان زد جملہ ’’زبان فارسی خیلے دشوار است لیکن شیریں است‘‘ مبنی بر حقیقت ہے۔ ہمارے اسلاف جن کا تعلق اردو، فارسی اور عربی سے بہت گہرا تھا، مگر گردش ایام، رفتار زمانہ اور انقلاب دہر اثر انداز ہوگئے نتیجتاً فارسی کی بہ استثنائے چند وہ حیثیت باقی نہیں رہی بلکہ اس سے دوری ہوتی گئی۔وقت کے پھیرے حالات کے تھپیڑے، تعلیمی زاویے، لسانی نظریے، سیاسی اندازے، فکری رویے، ذہنی قائمے، حیاتیاتی تقاضے اور ماحولیاتی مطالبے نے اس میں مزید شدت پیدا کردی، جس کی وجہ سے بالائے ذکر اقتباسات اور اسی ادارے کی مطبوعہ دیگر کتابوں کے متعلقہ مندرجات ومحتویات کے ذیل میں پیش کئے جانے والے غیر مترجم فارسی کے اقتباسات اور آب دار اشعار کے افہام وتفہیم میں دشواری ہوتی ہے اور اس کے لئے بڑی ذہنی ورزش کرنی پڑتی ہے۔اس لئے دارالمصنّفین کی مجلس

منتظمہ سے گزارش ہے کہ وہ اپنی ان کتابوں کو جو اس طرح کے متعلقہ غیر مترجم فارسی وعربی کے اقتباسات وعبارات نیز برمحل اشعار سے مزین ہیں کا اردو ترجمہ کرادے۔اسی طرح ان میں درج عربی کے رجال واماکن کے نام پر اعراب لگوادے، علاوہ ازیں ان کتابوں میں اردو رسم الخط میں مکتوب انگریزی اسماء کو انگریزی میں بھی لکھوادے تاکہ صحیح تلفظ کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جاسکے اور صہبائے مطالعہ دوآتشہ ہوسکے۔کیوں کہ تلفظ زبان کا جزء لاینفک ہے۔

چوں کہ دارالمصنّفین کے وابستگان نے مسلمانان ہند اور باشندگان وطن کے بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کے فریضے کی انجام دہی کے لئے اپنے دلوں کی تپش سے چراغ جلائے ہیں۔ یہ دارالمصنّفین کے ایک معمولی قدرداں اور معارف کے ایک ادنیٰ قاری کے" کتنے قصے ہیں جو بیگانہ اظہار رہے" کے حامل تاثرات وگزارشات ہیں۔

راجو خان

۹۱۲۲۷۸۰۱۹۸

معارف

میں گذشتہ کئی برس سے معارف کا قاری ہوں۔ ماشاءاللہ آپ کی ادارت میں رسالہ دین دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔اسلاف کی میراث کو جدید وقدیم سنگم کے ساتھ آپ نے جس انداز سے آگے بڑھایا ہے وہ آپ کا ہی حصہ ہے۔آپ ہماری ملت کی آن، بان اور شان ہیں۔ میں خداوند قدوس سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو اپنے سایۂ عاطفت میں رکھے اور صحت وسکون عطا فرمائے۔ یہ رقعہ میں آپ کو دارالمصنّفین کی ویب سائٹ کے بارے میں توجہ دلانے کے لئے لکھ رہا ہوں۔گذشتہ کئی ماہ سے معارف کے شمارے اپلوڈ نہیں ہورہے ہیں۔جس کی وجہ سے معارف کے بہت سے شائقین اس سے استفادہ سے محروم ہیں۔ جناب والا سے بصد احترام گذارش ہے کہ اس جانب توجہ دیں۔

محمد لعل چاند شیخ، ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

mdlalchand.jmi@gmail.com

معارف: معارف بلکہ شبلی اکیڈمی کی ویب سائٹ خراب ہے۔اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

رسید کتب موصولہ

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، **تذکرۂ رفتگاں**: جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ، صفحات:۴۳۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۸۷۶۴۶۵

نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی، **تفسیر ماجدی انگریزی، تفسیر القرآن- ایک مطالعہ**: شباب بک ڈپو، ندوہ روڈ، لکھنؤ، صفحات: ۱۶۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۲۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۳۳۵۹۲۹۶۷۰

محمد عطیہ خمیس، مترجم محمد ناصر سعید اکرمی، **حج اور خواتین**: مکتبہ ملت دیو بند، یو پی، صفحات: ۱۶۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۲۲۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۹۰۲۱۰۵۳۰۰

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، **خانوادۂ شبلی**: نعیم بک سیلرز، مئوناتھ بھنجن، صفحات: ۲۰۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۷۵۵۸۲۰

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، **رسول اللہؐ شعبِ ابی طالب میں**: ڈائمنڈ پرنٹرس، نئی دہلی، صفحات: ۲۱۶، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۹۱۰۷۰۶۶۷۳

ابراہیم محمد الجمل، مترجم محمد ناصر سعید اکرمی، **کبائر النساء**: مکتبہ نعیمیہ دیو بند، یو پی، صفحات: ۱۷۶، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۲۳۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۲۴۹۲۶۸۸

ڈاکٹر مرزا ندیم بیگ، **مسلم پٹی تاریخ کے آئینے میں**: بھارت میڈیکل اسٹور، سرائے میر، اعظم گڑھ، صفحات: ۱۷۶، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۵۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۱۱۸۳۷۷۳۸۷

ڈاکٹر ابو سعد اعظمی، **مطالعات فراہیؒ**: براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات: ۱۹۷، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۵۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۷۹۰۶۸۶۳۴۶۱

مولانا محمد شکیل عباسی ندوی، مرتب: ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، **مکاتیب روحانی**: احمد فرید عباسی، پرنسپل رفیع میموریل انٹر کالج چلکچئی، بیارا، سدھارتھ نگر، صفحات ۳۲۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۱۰۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۵۸۲۲۲۴

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، **نسخۂ کیمیا**: مکتبہ دینی تعلیمی کونسل عارف آشیانہ، چوک لکھنؤ، صفحات: ۷۰۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت: ۱۲۰۰/روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۵۸۲۲۱۱

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول 〃 〃	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم 〃 〃	190/-
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

MAY 2024 Vol- 211(5) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندوی	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعاتِ شبلی	//	550/-
حیاتِ سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازیؒ	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	600/-
تذکرۃ المحدثین اول	مولانا ضیاءالدین اصلاحی	200/-
تذکرۃ المحدثین دوم	//	225/-
تذکرۃ المحدثین سوم	//	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاءالدین اصلاحی	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلی	330/-
تاریخ اسلام اول ودوم (مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندوی	560/-
تاریخ اسلام سوم و چہارم (مجلد)	//	500/-
تاریخ صقلیہ اول ودوم (مجلد)	سید ریاست علی ندوی	800/-
تاریخ اندلس (چار جلدیں)	//	1200/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاءالدین اصلاحی	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	550/-